ڈاچی

اوپندرناتھ اشک

ڈاچی

و

دیگر سیاسی افسانے

از

اوپندر ناتھ اشک

مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور

ناشر
اُردو بک سٹال لاہور

بار اوّل ۲۰۰۰   ۱۹۳۹ء   قیمت:- ۸عہ

اُن آرزوؤں کے نام جو پُوری نہ ہوئیں۔

فہرست

عرضِ ناشر

لاہور
ستمبر ۱۹۳۹ء

ادبی دنیا میں اشک صاحب کی ذات آج کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ملک کے ادبی حلقوں میں آپ کی کہانیاں اور ڈرامے بڑے شوق سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ آج سے چھ سات سال پہلے جب آپ کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ "عورت کی فطرت" کے نام سے شائع ہوا تھا، تو پریم چند مرحوم نے اس کے دیباچہ میں لکھا تھا۔

"میں اشک صاحب کی کہانیوں کو برابر شوق اور رغبت سے پڑھتا رہا ہوں اور مجھے ان میں تاثیر کا احساس ہوا ہے۔"

اور اشک صاحب کے افسانوں کی یہ تاثیر ہی ہے۔ جس کی وجہ سے کئی برس پہلے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی۔ کہ آپ کے افسانوں کا کوئی مجموعہ کچھ اچھی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن ایک تو اس وقت کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور دوسرے اشک صاحب ہندی کی طرف چلے گئے تھے۔

آپ کو ہندی کی طرف لیجانے والے بھی مرحوم پریم چند ہی تھے۔ اسی زمانہ میں جب 'عورت کی فطرت' شائع ہوئی تھی۔ مرحوم پریم چند نے آپ کی کچھ کہانیاں ترجمہ کروا کر اپنے ہندی ماہانہ 'ہنس' میں شائع کی تھیں۔ وہ کچھ اتنی پسند کی گئیں۔ کہ دو ایک سال بعد اشک صاحب باقاعدہ ہندی میں لکھنے لگے۔ اور آپ نے صرف کہانیوں پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ڈرامے اور نظمیں بھی لکھیں۔ جو بے حد مقبول ہوئیں — آپ کے ڈرامے پنجاب یونیورسٹی اور راجپوتانہ ایجوکیشن بورڈ کے کورس میں لئے گئے ہیں۔ آپ کی نظمیں اپنی سادگی اور جذبات نگاری کیلئے مشہور ہیں اور ہندی کا کوئی بھی ایسا رسالہ نہیں جس میں آپ کے افسانے نہ شائع ہوتے اور پسند کئے جاتے ہوں

ادھر ایک ڈیڑھ سال سے آپ پھر اردو رسائل و جرائد میں نظر آنے لگے ہیں میں نے 'ادبی دنیا' اور 'ہمایوں' میں آپ کی کچھ کہانیاں دیکھیں۔ اور انہیں پڑھ کر میرے دل میں اپنی پرانی خواہش کو پھر عملی جامہ پہنانے کی آرزو شدت سے پیدا ہوئی۔

اس عرصہ میں اردو بک سٹال کا انتظام میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اور میں اسے اس درجہ مستحکم کر چکا تھا کہ اشاعت کا بار اٹھا سکوں۔

چنانچہ آج اشک صاحب کے سیاسی افسانوں کا مجموعہ اردو داں پبلک کے

سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ دوسری زبانوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ "ڈاچی" تو اتنا پسند ہوا ہے کہ ہندی کے علاوہ گجراتی۔ مرہٹی۔ پنجابی اور انگریزی میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی یہ براڈ کاسٹ ہوا ہے۔ اور اسے شائع کرنے کی اجازت دینے کیلئے میں ڈائریکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو لاہور کا نہایت شکر گذار ہوں۔

امید ہے کہ میں بہت جلد اشک صاحب کے اُن افسانوں کا مجموعہ بھی اُردو دان پبلک کی خدمت میں پیش کر سکونگا۔ جن میں انہوں نے ہماری معاشرتی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ظہیر

پیش لفظ

لاہور
ستمبر ۱۹۳۹ء

انگلستان کے مشہور انشاپرداز گالزوردی نے اپنی کہانیوں
کے ایک مجموعہ کا دیباچہ لکھتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے۔ کہ پبلک کے نت نئے
دن بدلتے ہوئے مذاق کے پیشِ نظر افسانہ نویس کے لئے یہ جاننا نہایت مشکل
ہے۔ کہ اسکی کونسی کہانی ادب میں مستقل درجہ حاصل کرے گی۔ لیکن اگر ہم قدیم
زمانہ کی لمبی بے ربط کہانیوں کا جن میں ایک کہانی سے دوسری کہانیاں اس طرح
نکلی آتی ہیں جس طرح پیاز کے چھلکے اور دورِ جدید کی مختصر اور اپنے کلائمکس

کی طرف بغیر ادھر ادھر کٹے تیر کی طرح سیدھی جانے والی کہانی کا مطالعہ کریں تو ہم کامیاب افسانہ کے ایک جزو کو پالیں گے۔ کوئی افسانہ، چاہے وہ ادب میں مستقل درجہ حاصل کرے یا نہ کرے، اور بدلتے ہوئے فن پر پورا اترے یا نہ اترے لیکن اگر اس میں وہ جزو موجود ہے تو وہ تو چاہے جب بھی ہو اشوق سے پڑھا جائیگا مرحوم منشی پریم چند نے اس جزو کو "تاثیر" کا نام دیا ہے۔

افسانہ نویسی، اسکے فن، اور مختصر افسانہ کے مختلف ارکان کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کہ انفرادی طور پر میرے لئے ان پر کچھ لکھنا محض تضیع اوقات کے مترادف ہوگا۔ عورت کی فطرت کے دیباچہ میں مرحوم پریم چند نے لکھا تھا۔

"دیگر اصنافِ سخن کی طرح افسانہ کی کامیابی کا انحصار بھی اسکی تاثیر میں ہے۔ اور تاثیر کیا جذباتِ نفسیہ کا ہیجان جب دلچسپی کمال کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو وہ تاثیر بن جاتی ہے۔ دلچسپی کے کئی ارکان ہیں۔ مثلاً زبان کی نمکینی و ظرافت خیالات کی جدت و ندرت مشاہدات کی واقعیت و اصلیت اور وہ خداداد ملکہ جس سے مصنف انسان کے جذبات کی گہرائی تک پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انداز بیان میں ایک بیساختگی اور بے تکلفی کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح کوئی نازک شعر آنکھوں کے سامنے آتے ہی دل میں ایک طوفان پیدا کر دیتا ہے، اسی طرح کہانی بھی وہی مرغوب ہوتی ہے

ہے پڑھ کر ہمارے دل میں ایک میٹھا درد اور ایک سرور انگیز اضطراب پیدا ہو جائے۔ کچھ ایسی بے چینی، گویا ہماری کوئی پیاری چیز کھو گئی ہے گویا ہم کسی وادیِ جنت میں گم ہو گئے ہیں۔"

ایک کامیاب افسانہ کی جو تعریف منشی پریم چند نے کی ہے اور اسکے جو ارکان بتائے ہیں وہ سمجھ لیجئے ان سب مضامین کا نچوڑ ہیں جو افسانہ نویسی کے فن پر لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے اپنی طرف سے کچھ لکھے بغیر میں نے یہ اقتباس دے دیا ہے میرے اپنے افسانے اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ اسکے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ جاننا ناقد کا کام ہے۔ ہاں اپنی طرف سے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں اس معیار پر پہنچنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہوں۔

زبان

ایک بار میں نے مرحوم پریم چند کو اپنی ایک کہانی "نشانیاں" بھیجی جو بعد میں انہوں نے "ہنس" میں نمایاں جگہ پر شائع کی۔ انہی دنوں میں میری ایک کہانی الہ آباد کے مشہور ہندی ماہانہ 'سرسوتی' میں شائع ہوئی تھی۔ اسکا نام تھا۔ "پریم کی ویدی"۔ اور یہ میری اردو کہانی "قربان گاہِ عشق" کا لفظ بہ لفظ ترجمہ تھی۔ چونکہ یہ پہلی ہی کہانی تھی جس کا میں نے خود ہندی میں ترجمہ کیا تھا۔ اسلئے ہندی لکھنے کے جوش میں میں نے اسمیں نادانستہ طور پر ہندی الفاظ ٹھونس دیے تھے اسکے بعد ہی بمبئی سے مجھے مرحوم پریم چند کا ایک طویل خط ملا جس میں دونوں کہانیوں کے حسن و قبح پر غور کرتے ہوئے انہوں نے زبان کے متعلق بھی اپنی رائے دی تھی۔

"نشانیاں لکھنے پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ بہت اچھی چیز ہے۔ سرسوتی میں تمہاری کہانی 'پریم کی ویدی' پڑھی۔ اسمیں تم نے خواہ مخواہ ہندی الفاظ ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں لفظ، اردو، فارسی، عربی، انگریزی کہیں سے کیوں نہ لیا جائے ضروری یہ ہے کہ تحریر کی روانی اور خیالات کا تسلسل قائم رہے"

اردو میں ایک حلقہ ایسا ہے۔ جس کا دائرہ نظر اتنا تنگ ہے کہ وہ مصنف کو ذراسی ڈھیل بھی دینے کو تیار نہیں۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب اردو کو ہندوستان بھر کی مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تو اس تنگ نظری سے کام نہ چلے گا۔ جب تمام صوبوں کے مصنف اردو میں لکھنے لگیں گے۔ تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ کچھ صوبائی الفاظ اردو میں آجائینگے۔ بجائے اس کے کہ ان کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کیا جائے یہ کہیں بہتر ہوگا۔ کہ انکو اپنا لیا جائے۔

اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا۔ کہ زبان کو وسعت ملیگی بلکہ تحریر کی روانی اور خیالات کا تسلسل قائم رکھنے میں بھی آسانی ہوگی۔

حال ہی میں میرے ایک دوست نے میری کہانی کے ایک فقرہ پر اعتراض کیا۔ فقرہ یوں تھا۔

" اگر کہیں بندر ہمیں کی ڈول ہو جائے تو بال بچوں کا پیٹ پالنے کی سبیل ہو"

انہوں نے کہا کہ ڈول دلی کی زبان کا لفظ نہیں اور انہوں نے ڈول کی جگہ بھی سبیل ہی لکھ دیا۔ اب ایک چھوٹے سے فقرے میں ایک لفظ کا دوبارہ آ

جانا کانوں کو برا لگتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ڈول دِلی کی زبان کا لفظ نہیں لیکن میں اسے اپنا لینا برا نہیں سمجھتا۔

اسی طرح ایک دوست نے نِٹھلّا لفظ پر اعتراض کیا۔ اور نکھٹو لفظ تجویز کیا۔ لیکن چونکہ دوسرے فقرے میں نکما لفظ آتا تھا۔ اور نکھٹو وہاں کانوں کو کھٹکتا تھا۔ اس لئے میں نے نِٹھلّا ہی رہنے دیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ میری زبان میں کوئی غلطی ہی نہ ہوگی۔ میں نے صرف اپنا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے میرے دوستوں کو اتفاق نہ ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا ہے۔ تو اسکا دائرہ کچھ نہ کچھ وسیع ضرور ہونا چاہیئے۔

زیرِ نظر مجموعہ

زیر نظر مجموعہ کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اسمیں میری پہلی کوششیں بھی شامل ہیں اور بالکل نئی بھی۔ اس میں کچھ کہانیاں بے حد پسند کی گئی ہیں مجھے امید ہے۔ ہر مذاق کے ناظر اسمیں کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان پائیں گے۔ ناقدین فن سے میری صرف یہ استدعا ہے۔ کہ وہ جو کچھ لکھیں اسے مجھ تک پہنچانے کی بھی عنایت کریں۔ اپنے نقادوں کی رائے سے میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے

۴۸ انار کلی
یکم ستمبر ۱۹۳۹ء

اوپندر ناتھ اشک

اوپندر ناتھ اشک

ڈاچی

ابوہر
ستمبر ۱۹۳۷ء

مہینوں تنکا تنکا جوڑ کر، بھولے پنچھی نے ننھا سا آشیانہ بنایا۔
آہ! لیکن صیاد کے ظالم ہاتھ کی ایک جنبش نے اسے پھر تنکا تنکا کر دیا۔

پی سکندر کے مسلمان جاٹ باقر کو اپنے مال کی طرف حریصانہ نگاہوں سے تاکتے دیکھ کر اوکانہہ[1] کے گھنے درخت سے ٹیک لگائے نیم غنودگی کی سی حالت میں بیٹھا چوہدری نندوا اپنی اونچی گھر گھراتی آواز میں للکار اٹھا — تے[2] رے اُٹھے کے کرے ہے؟ اور اس کا چھ فٹ لمبا لحیم شحیم جسم تن گیا اور بٹن ٹوٹ جانے کی وجہ سے موٹی کھادی کے کرتے سے اس کا چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط کندھے صاف دکھائی دینے لگے۔

---

[1] ایک مقامی درخت [2] ارے یہاں کیا کر رہا ہے؟

باقر ذرا نزدیک آ گیا۔ گرد سے بھری ہوئی نکیلی ڈاڑھی اور شرعی مونچھوں کے اوپر گڑھوں میں دھنسی ہوئی دو آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک پیدا ہوئی۔ اور ذرا مسکرا کر اس نے کہا —— ڈاچی دیکھ رہا تھا چوہدری۔ کیسی خوبصورت اور جوان ہے۔ دیکھ کر بھوک مٹتی ہے۔

اپنے مال کی تعریف سن کر چوہدری نندو کا تناؤ کچھ کم ہوا۔ خوش ہو کر بولا۔ کیسی سانڈ[1]؟

—— وہ پرلی سے چوتھی! باقر نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اوکانہہ کے ایک گھنے پیڑ کے سائے میں آٹھ دس اونٹ بندھے تھے۔ انہی میں وہ جوان سانڈنی اپنی لمبی، خوبصورت اور سڈول گردن بڑھائے بیتوں میں منہ مار رہی تھی۔ مال منڈی میں دور —— جہاں تک نظر کام کرتی تھی، بڑے بڑے اونچے اونٹوں، خوبصورت سانڈنیوں، کالی موٹی، بے ڈول بھینسوں اور گابوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ گدھے بھی تھے پر نہ ہونے کے برابر۔ زیادہ تر تو اونٹ ہی تھے۔ بہاول نگر کے ریگستانی علاقہ میں ان کی کثرت ہے بھی قدرتی۔ اونٹ ریگستان کا جانور ہے۔ اس تپتے، ریتیلے علاقہ میں آمد و رفت، کھیتی باڑی اور باربرداری کا کام اسی سے ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں میں، جب گائیں دس دس اور بیل پندرہ پندرہ روپے میں مل جاتے تھے، تب بھی اچھا اونٹ پچاس سے کم میں ہاتھ نہ آتا تھا اور اب بھی جب اس علاقہ میں نہر آ گئی ہے۔ اور پانی

---

[1] کونسی ڈاچی؟

کی اتنی قلّت نہیں رہی اونٹ کی وقعت کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھی ہی ہے۔ سواری کے اونٹ دو دو سو سے تین تین سو تک بِک جاتے ہیں اور باہی اور باربرداری کے بھی اسّی نوّے سے کم میں ہاتھ نہیں آتے۔

ذرا اور آگے بڑھ کر باقر نے کہا — سچ کہتا ہوں چوہدری، اس جیسی خوبصورت سانڈنی مجھے ساری منڈی میں دکھائی نہیں دی۔

مسرّت سے نندو کا سینہ دُگنا ہو گیا۔ بولا — آ ایک ہی کے،[1] ایہہ تو سگلی بھوٹڑی ہیں۔ ہُوں تو اِنہیں چارہ پھلونسی نیر یا کروں!

آہستہ سے باقر نے پوچھا — بیچو گے اسے؟

— اٹھی بیچنے لئی تو لایا ہوں![2] نندو نے ذرا ترشی سے کہا۔

— تو پھر بتاؤ کتنے کو دو گے؟ باقر نے پوچھا۔

نندو نے باقر پر سر سے پاؤں تک ایک نگاہ ڈالی۔ اور ہنستے ہوئے بولا۔ تنے[3] چاہی جے، کا تیرے دھنی بئی مول لیسی؟

مجھے چاہیئے — باقر نے ذرا سختی سے کہا۔

نندو نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ اس مزدور کی یہ بساط کہ ایسی خوبصورت ڈاچی مول لے۔ بولا — توں[4] کی لیسی؟

باقر کی جیب میں پڑے ہوئے ڈیڑھ سو کے نوٹ جیسے باہر اچھل پڑنے کو

---

[1] یہ ایک ہی کیا؟ یہ تو سبھی خوبصورت ہیں۔ میں تو ان کو چارہ اور پھلوسی (گوارے اور موٹھ کا نیرا) دیتا ہوں۔ [2] یہاں بیچنے کیلئے تو لایا ہوں۔
[3] تجھے چاہیئے یا اپنے مالک کے لئے مول لیگا [4] تو کیا لیگا؟

بیقرار ہو اٹھے۔ ذرا جوش سے اس نے کہا ـــــ تمہیں اس سے کیا، کوئی لے ۔ تمہیں تو اپنی قیمت سے غرض ہے، تم مول بتاؤ؟

نندو نے اس کے بوسیدہ کپڑوں، گھٹنوں سے اُٹھے ہوئے تہ بند اور جیسے نوح کی وقت سے بھی پرانے جوتے کو دیکھتے ہوئے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ـــــ جا[1] جا تو اِشی وِشی مول لے آ، اینگو مول تو آٹھ بیسی سوں گھاٹ کے نہیں۔

ایک لمحہ کے لئے باقر کے تھکے ہوئے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ چوہدری کہیں اتنا مول نہ بتا دے، جو اس کی بساط سے باہر ہو۔ لیکن اب جب اپنی زبان ہی سے اس نے ایک سو ساٹھ بتائے تو اُس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ ۱۵۰ تو اس کے پاس تھے ہی۔ اگر اتنے پر بھی چوہدری نہ مانا تو دس روپے کا اس سے اُدھار کر لیگا۔ بھاؤ تاؤ کرنا تو اِسے آتا نہ تھا جھٹ سے ڈیڑھ سو کے نوٹ نکالے اور نندو کے آگے پھینک دیئے۔ بولا ـــــ گن لو، ان سے زیادہ میرے پاس ایک پائی نہیں۔ اب آگے تمہاری مرضی!

نندو نے بادلِ ناخواستہ نوٹ گننے شروع کئے۔ لیکن گنتی ختم ہوتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے تو باقر کو ٹالنے کی غرض سے مول ۱۶۰ بتایا تھا۔ نہیں اس سانڈنی کے تو ۱۴۰ پانے کا خیال بھی اسے خواب میں نہیں تھا۔ لیکن دل کی خوشی کو دل ہی میں دبا کر اور جیسے باقر پر احسان کا بوجھ لادتے ہوئے نندو بولا ـــــ سانڈ[2] تو میری دو سے کی ہے، پن جا، سگّی مول میاں تنّے دس چھانڈیا۔

---

[1] جا جا تو کوئی ایسی ویسی ڈاچی لے لینا۔ اسکی قیمت تو ۱۶۰ سے کم نہیں۔ [2] سانڈنی تو میری دو سو کی ہے۔ پر جاؤ تمہیں ساری قیمت میں سے ۱۰ روپے چھوڑ دیئے۔

اور یہ کہتے کہتے اس نے اُٹھ کر سانڈنی کی رسّی باقر کے ہاتھ میں دے دی۔

ایک لمحہ کے لئے اس وحشی صفت انسان کا دل بھی بھر آیا۔ یہ سانڈنی اس کے یہاں ہی پیدا ہوئی اور پلی تھی۔ آج پال پوس کر اسے دوسرے کے ہاتھ میں سونپتے ہوئے اس کے دل کی کچھ ایسی ہی حالت ہوئی جو لڑکی کو سسرال بھیجتے وقت باپ کی ہوتی ہے۔ آواز اور لہجے کو ذرا نرم کر کے اس نے کہا۔ "آ سانڈ سوہری رہیڑی ہے۔ تو انہیں رہیڑہی میں نہ گیر دیتی ۔۔۔ ایسے ہی جیسے خسر داماد سے کہہ رہا ہو۔ میری لڑکی لاڈوں پلی ہے۔ دیکھنا اِسے تکلیف نہ ہو۔

خوشی کے پروں پر اڑتے ہوئے باقر نے کہا۔ تم فکر نہ کرو، جان دیکر پالونگا!

نندو نے نوٹ انٹی میں سنبھالتے ہوئے جیسے سوکھے ہوئے گلے کو ذرا تر کرنے کیلئے گھڑے سے مٹی کا پیالہ بھرا۔ منڈی میں چاروں طرف دُھول اڑ رہی تھی۔ شہروں کی مال منڈیوں میں بھی جہاں بیسیوں عارضی نلکے لگ جاتے ہیں۔ اور سارا سارا دن چھڑکاؤ ہوتا رہتا ہے۔ دھول کی کمی نہیں ہوتی۔ پھر اس ریگستان کی منڈی میں تو دھول ہی کی سلطنت تھی۔ گنّے والے کی گنڈیروں پر۔ حلوائی کے حلوے اور جلیبیوں پر۔ اور خونچے والے کے دہی بکوڑی پر غرض سب جگہ دُھول ہی دھول نظر آتی تھی۔ گھڑے کا پانی ٹانچیوں کے ذریعے نہر سے لایا گیا تھا۔ پر یہاں آتے آتے کیچڑ جیسا گدلا ہو گیا تھا۔ نندو کا خیال تھا نتھرنے پر پیئے گا پر گلا کچھ سوکھ رہا تھا۔ ایک ہی گھونٹ میں پیالے کو ختم کر کے نندو نے اس سے بھی پینے کیلئے کہا۔ باقر آیا تھا تو اسے غضب کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ پر اب اسے پانی پینے کی

لہ یہ سانڈنی اچھی طرح پلی ہے۔ تو یونہی اس کی مٹی خراب نہ کر دینا۔

فرصت کہاں، رات ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنے گاؤں میں پہنچ جانا چاہتا تھا
ڈاچی کی رسّی پکڑے ہوئے گرد و غبار کو جیسے چیرتا ہوا وہ چل پڑا۔

باقر کے دل میں بڑی دیر سے ایک خوبصورت اور جوان ڈاچی خریدنے کی آرزو تھی۔ ذات سے وہ کمین تھا اس کے آباؤ اجداد کمہاروں کا کام کرتے تھے۔ لیکن اس کے باپ نے اپنا قدیم پیشہ چھوڑ کر مزدوری سے اپنا پیٹ پالنا شروع کر دیا تھا۔ اور باقر بھی اسی پیشہ کو اختیار کئے ہوئے تھا۔ مزدوری وہ زیادہ کرتا ہوئے یہ بات نہ تھی۔ کام سے ہمیشہ اس نے جی چرایا تھا۔ اور چراتا بھی کیوں نہ؟ جب اس کی بیوی اس سے دُگنا کام کر کے اس کے بوجھ کو بٹانے اور اسے آرام پہنچانے کے لئے موجود تھی۔ کنبہ بڑا تھا نہیں۔ ایک وہ، ایک اس کی بیوی اور ایک ننھی سی بچی۔ پھر کس لئے وہ جی ہلکان کرتا؟ لیکن یہ فلک بے پیر — اس نے اسے سکھ سے نہ بیٹھنے دیا۔ اس نیند سے بیدار کر کے اسے اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کیلئے مجبور کر دیا۔ اسے بتا دیا کہ زندگی میں سکھ ہی نہیں، آرام ہی نہیں، دُکھ بھی ہے۔ محنت اور مشقت بھی ہے!

پانچ سال ہوتے اس کی وہی آرام دینے والی عزیز بیوی۔ گڑیا سی ایک لڑکی کو چھوڑ کر اس جہان سے رحلت کر گئی۔ مرتے وقت اپنے سب سوز کو اپنی پھیکی اور اداس آنکھوں میں بھر کر اس نے باقر سے کہا تھا — میری رضیہ اب تمہارے حوالے ہے۔ اسے تکلیف نہ ہونے دینا۔ اور اسی ایک فقرے نے باقر کی تمام زندگی کے رُخ کو پلٹ دیا تھا۔ اپنی شریکِ حیات کی وفات کے بعد وہ اپنی بیوہ

بہن کو اس کے گاؤں سے لے آیا تھا۔ اور اپنی آلس اور غفلت کو چھوڑ کر اپنی مرحوم بیوی کی آخری آرزو کو پورا کرنے میں جی جان سے منہمک ہو گیا تھا۔

یہ ممکن بھی کیسے تھا کہ اپنی بیوی کی، اپنی اس بیوی کی — جسے وہ روح کی گہرائیوں کے ساتھ محبت کرتا تھا جس کی موت کا غم اس کے دل کے نامعلوم پردوں تک چھا گیا تھا۔ جس کے بعد عمر ہونے پر بھی، مذہب کی اجازت ہونے پر بھی، رشتہ داروں کے مجبور کرنے پر بھی اس نے دوسری شادی نہ کی تھی — اپنی اسی بیوی کی آخری خواہش کو بھلا دیتا۔

وہ دن رات جی توڑ کر کام کرتا تھا تاکہ اپنی مرحوم بیوی کی اس امانت کو، اپنی اُس ننھی سی گڑیا کو طرح طرح کی چیزیں لاکر دے سکے۔ جب بھی کبھی وہ منڈی سے آتا، ننھی رضیہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کے گرد سے اٹے ہوئے چہرے پر جما کر پوچھتی ― "ابا میرے لئے کیا لائے ہو؟" تو وہ اسے اپنی گود میں لے لیتا۔ اور کبھی مٹھائی اور کبھی کھلونوں سے اس کی جھولی بھر دیتا۔ تب رضیہ اس کی گود سے اتر جاتی۔ اور اپنی سہیلیوں کو اپنی مٹھائی اور کھلونے دکھانے کے لئے بھاگ جاتی — یہی گڑیا سی لڑکی جب آٹھ برس کی ہوئی، تو ایک دن مچل کر اپنے ابا سے کہنے لگی — "ابا ہم تو ڈاچی لینگے" ابا ہمیں ڈاچی لے دو! بھولی معصوم لڑکی! اسے کیا معلوم کہ وہ ایک مفلس اور قلاش مزدور کی لڑکی ہے جس کیلئے سانڈنی خریدنا تو کجا۔ اس کا تصور کرنا بھی گناہ ہے۔ روکھی ہنسی کے ساتھ باقر نے اسے گود میں اٹھا لیا اور بولا — "رجو تو تو خود ڈاچی ہے۔" پر رضیہ نہ مانی۔ اس دن، مشیر مال اپنی سانڈنی پر چڑھ کر اپنی چھوٹی سی لڑکی کو آگے بٹھائے

اس کاٹے[1] میں کچھ مزدور لینے آئے تھے۔ تبھی رضیہ کے ننھے سے دل میں ڈاچی پر سوار ہونے کی زبردست خواہش پیدا ہو اٹھی تھی۔۔ اور اسی دن سے باقر کی رہی سہی غفلت بھی دور ہو گئی تھی۔

اس نے رضیہ کو ٹال تو دیا تھا۔ پر دل ہی دل میں اس نے عہد کر لیا تھا۔ کہ چاہے جو ہو وہ رضیہ کے لئے ایک خوبصورت ڈاچی ضرور مول لیگا۔ اور تب اسی علاقہ میں جہاں اس کی آمدنی کی اوسط مہینہ بھر میں تین آنہ روزانہ بھی نہ ہوتی تھی۔ وہیں اب آٹھ دس آنے ہو گئی۔ دور دور کے دیہات میں اب وہ مزدوری کے لئے جاتا۔ کٹائی اور بجائی کے دنوں میں دن رات جان لڑاتا۔۔ فصل کاٹتا، دانے نکالتا، کھلیانوں میں اناج بھرتا، نیرا ڈال کر کُپ بناتا۔ بجائی کے دنوں میں ہل چلاتا۔ بیلیاں بناتا۔ نرائی کرتا۔ ان دنوں میں اسے پانچ آنے سے آٹھ آنے تک روزانہ مزدوری مل جاتی۔ جب کوئی کام نہ ہوتا تو علی الصباح اُٹھ کر، آٹھ کوس کی منزل مار کر منڈی جا پہنچتا۔ اور آٹھ دس آنے کی مزدوری کر کے ہی واپس لوٹتا۔ ان دنوں میں وہ روز چھ آنے بچاتا آ رہا تھا۔ اس معمول میں اس نے کسی طرح کی ڈھیل نہ آنے دی تھی۔ اسے جیسے جنون سا ہو گیا تھا۔ بہن کہتی۔۔ باقر، اب تو تم بالکل ہی بدل گئے ہو، پہلے تو کبھی تم نے اس طرح جی توڑ کر محنت نہ کی تھی۔

باقر ہنستا اور کہتا۔۔ تم چاہتی ہو، میں تمام عمر اسی طرح نٹھلا بیٹھا رہوں۔

بہن کہتی۔۔ نکما بیٹھنے کو تو میں نہیں کہتی۔ لیکن صحت گنوا کر دھن جمع کرنے کی صلاح بھی میں نہیں دے سکتی۔

[1] بیس پچیس جھُنگیوں کا گاؤں

ایسے وقت ہمیشہ باقر کے سامنے اس کی مرحوم بیوی کی تصویر کھنچ جاتی۔ اُس کی آخری آرزو اس کے کانوں میں گونج جاتی اور وہ صحن میں کھیلتی ہوئی رضیہ پر ایک پیار کی نظر ڈال کر ہونٹوں پر پرسوز مسکراہٹ لئے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ جاتا اور آج ــــ آج ڈیڑھ سال کی کڑی مشقت کے بعد وہ مدت سے پالی ہوئی اپنی اس آرزو کو پوری کر سکا تھا۔ سانڈنی کی رسّی اس کے ہاتھ میں تھی اور سرکاری کھالے[1] کے کنارے کنارے وہ چلا جا رہا تھا۔

شام کا وقت تھا اور مغرب میں غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں دھرتی کو سونے کا آخری دان دے رہی تھیں۔ ہوا میں کچھ خنکی آ گئی تھی اور کہیں دور ــــ کھیتوں میں ٹٹیہری ٹیہوں ٹیہوں کر کے اڑ رہی تھی ــــ باقر کی نگاہِ تصور کے سامنے ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے آ رہے تھے۔ ادھر اُدھر سے کوئی کسان اپنے اونٹ پر سوار جیسے پھدکتا ہوا نکل جاتا۔ اور کبھی کبھی کھیتوں سے واپس آنے والے کسانوں کے لڑکے چھکڑے پر رکھے ہوئے گھاس کے گٹھوں پر بیٹھے بیلوں کو پچکارتے، کسی دیہاتی گیت کا ایک آدھ بند گاتے یا چھکڑے کے پیچھے بندھے ہوئے خاموشی سے چلے آنے والے اُونٹوں کی تھوتھنیوں سے کھیلتے چلے آتے تھے۔

باقر نے جیسے، خواب سے بیدار ہو کر مغرب کی طرف غروب ہوتے آفتاب کو دیکھا۔ اور پھر سامنے کی طرف ویرانے میں نظر دوڑائی۔ اس کا گاؤں ابھی بڑی دُور تھا۔ مسرت سے پیچھے کی طرف دیکھ اور چپ چاپ چلی آنے والی سانڈنی کو

---

[1] نہر کی چھوٹی سی شاخ (راج بہا)

پیار سے بچکار کر وہ اور بھی تیزی سے چلنے لگا۔ کہیں اس کے پہنچنے سے پہلے رضیہ سو نہ جائے اِسی خیال سے۔

مشیر مال کی کاٹ نظر آنے لگی۔ یہاں سے اس کا گاؤں نزدیک ہی تھا۔ یہی کوئی دو کوس! باقر کی چال دھیمی ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی تصور کی دیوی اپنی رنگ برنگی کوچی سے اس کے دماغ کی قرطاس پر طرح طرح کی تصویریں بنانے لگی۔ باقر نے دیکھا، اس کے گھر پہنچتے ہی ننھی رضیہ مسرت سے ناچ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی ہے۔ اور پھر ڈاچی کو دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت اور مسرت سے بھر گئی ہیں، پھر اس نے دیکھا وہ رضیہ کو اپنے آگے بٹھائے سرکاری کھالے کے کنارے ڈاچی پر بھاگا جا رہا ہے۔۔۔ شام کا وقت ہے مست، ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور کبھی کبھی کوئی پہاڑی کوّا اپنے بڑے بڑے پروں کو پھیلائے اپنی موٹی آواز سے ایک دو بار کائیں کائیں کر کے اوپر سے اڑتا چلا جاتا ہے۔ رضیہ کی خوشی کا وار پار نہیں، وہ جیسے ہوائی جہاز میں اڑی جا رہی ہے! پھر اس کے سامنے آیا۔۔۔ وہ رضیہ کو لئے بہاول نگر کی منڈی میں کھڑا ہے۔ ننھی رضیہ جیسے بھونچکی سی ہے۔ حیران سی کھڑی وہ ہر طرف اناج کے اِن بڑے بڑے ڈھیروں کو، لاانتہا چھکڑوں کو اور تعجب حیرت میں گم کر دینے والی اِن بے شمار چیزوں کو دیکھ رہی ہے۔ ایک دوکان پر گراموفون بجنے لگتا ہے۔ لکڑی کے اس ڈبے سے کس طرح گانا نکل رہا ہے، کون اس میں چھپا گا رہا ہے، یہ سب باتیں رضیہ کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور یہ سب جاننے کیلئے

اس کے دل میں جو اشتیاق ہے۔ وہ اس کی آنکھوں سے ٹپکا پڑتا ہے۔
اپنے تصوّر کی دنیا میں محو وہ کماٹ کے پاس سے گذرا جا رہا تھا۔ کہ اچانک کچھ خیال آجانے سے وہ رُکا۔ اور کاٹ میں داخل ہو گیا۔ مشیر مال کی کاٹ بھی کوئی بڑا گاؤں نہ تھا۔ ادھر کے سب گاؤں ایسے ہی ہیں۔ زیادہ ہوئے تو تیس چھپر ہو گئے کڑیوں کی چھت کا یا پکی اینٹوں کا مرکان ابھی اس علاقے میں نہیں۔ خود باقر کی کاٹ میں پندرہ گھر تھے — گھر کہاں سرکنڈوں کی جھنگیاں تھیں۔ مشیر مال کی کاٹ[1] بھی ایسی ہی بیس پچیس جھنگیوں کی بستی تھی۔ صرف مشیر مال کا مکان کچی اینٹوں سے بنا تھا۔ لیکن چھت اس پر بھی سرکنڈوں ہی کی تھی۔ نانک بڑھئی کی جھنگی کے سامنے وہ رُکا۔ منڈی جانے سے پہلے وہ اس کے ہاں ڈاچی کا گدرا[2] بننے کے لئے دے گیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اگر رضیہ نے ڈاچی پر چڑھنے کی ضد کی تو وہ اسے کیسے ٹال سکے گا۔ اسی خیال سے وہ پیچھے مڑ آیا تھا۔ اس نے نانک کو دو ایک آوازیں دیں۔ اندر سے شائد اس کی بیوی نے جواب دیا۔

— گھر میں نہیں منڈی گئے ہیں!

باقر کی آدھی خوشی جاتی رہی۔ وہ کیا کرے؟ یہ نہ سوچ سکا۔ نانک اگر منڈی گیا ہے تو گدرا کیا خاک بنا کر گیا ہو گا۔ لیکن پھر اس نے سوچا — شاید بنا کر رکھ گیا ہو۔ اس نے پھر آواز دی — میں ڈاچی کا پالان بنتا دے گیا تھا۔

جواب ملا — ہمیں نہیں معلوم!

---

[2] پالان: کاٹھی۔

باقر کی سب خوشی جاتی رہی۔ گدرے کے بغیر وہ ڈاچی لے کر کیا جائے؟ نانک ہوتا تو اس کا پالان چاہے نہ بنا سہی، کوئی دوسرا ہی اس سے مانگ کر لے جاتا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے سوچا ــــ چلو منشیر مال سے مانگ لیں۔ ان کے تو اتنے اونٹ رہتے ہیں کوئی نہ کوئی پرانا پالان ہوگا ہی ابھی اسی سے کام چلا لینگے۔ تب تک نانک نیا گدرا تیار کر دیگا۔ یہ سوچ کر وہ منشیر مال کے گھر کیطرف چل پڑا۔

اپنی ملازمت کے دوران میں منشیر مال صاحب نے کافی دولت جمع کر لی تھی۔ اور جب ادھر نہر نکلی تو اپنے اثر و رسوخ سے ریاست ہی کی زمین میں کوڑیوں کے مول کئی مربعے زمین حاصل کر لی تھی۔ اب ریٹائر ہو کر یہیں آ رہے تھے۔ راہک (مزارع) رکھے ہوئے تھے۔ آمدنی خوب تھی۔ اور مزے سے بسر ہو رہی تھی۔ اپنی چوپال پر ایک تخت پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ سر پر سفید صافہ، گلے میں سفید قمیص، اس پر سفید جاکٹ، اور کمر میں دودھ جیسا سفید تہبند ــــ گرد سے اٹے ہوئے باقر کو سانڈنی کی رسی تھامے آتے دیکھکر اُنہوں نے پوچھا ــــ کہو باقر کدھر سے آ رہے ہو؟

باقر نے جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا ــــ منڈی سے آ رہا ہوں مالک!

ــــ یہ ڈاچی کس کی ہے؟

ــــ میری ہی ہے مالک! ابھی منڈی سے لا رہا ہوں۔

ــــ کتنے کو لائے ہو؟

باقر نے چاہا، کہہ دے، آٹھ بیسی کو لایا ہوں۔ اس کے خیال میں ایسی خوبصورت

ڈاچی، دو سو میں بھی سستی تھی، پر دل نہ مانا۔ بولا حضور مانگنا تو ۱۶۰ تھا، پر بات جیسی ہی کو لے آیا ہوں۔

مشیر مال نے ایک نظر ڈاچی پر ڈالی۔ وہ خود دیر سے ایک خوبصورت سی ڈاچی اپنی سواری کے لئے لینا چاہتے تھے۔ ان کی ڈاچی تو تھی پر گذشتہ سال اسے سیمک ہو گیا تھا۔ اور اگرچہ نیل وغیرہ دینے سے اس کا روگ تو دور ہو گیا تھا، پر اس کی چال میں وہ مستی، وہ لچک نہ رہی تھی۔ یہ ڈاچی ان کی نظر میں جچ گئی۔ کیا سڈول اور متناسب اعضا ہیں، کیا سفیدی مائل بھورا بھورا رنگ ہے، کیا لچلچاتی لمبی گردن ہے! بولے — چلو ہم سے آٹھ بیسی لے لو، ہمیں ایک ڈاچی کی ضرورت بھی ہے۔ دس تمہاری محنت کے رہے۔

باقر نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ حضور ابھی تو میرا چاؤ بھی پورا نہیں ہوا ہے۔

مشیر مال اُٹھ کر ڈاچی کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگے تھے — واہ کیا اصیل جانور ہے! بظاہر بولے — چلو پانچ اور لے لینا۔ اور انہوں نے نوکر کو آواز دی — نورے! ابے او نورے!

نوکر نوہرے میں بیٹھا بھینسوں کیلئے چٹّے کتر رہا تھا۔ گنڈاسہ ہاتھ ہی میں لئے ہوئے بھاگا آیا۔ مشیر مال نے کہا — یہ ڈاچی لے جا کر باندھ دو۔ ۱۶۵ میں، کہو کیسی ہے؟

نورے نے حیران سے کھڑے باقر کے ہاتھ سے رسّی لے لی۔ اور سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈاچی پر ڈال کر بولا — خوب جانور ہے۔ اور یہ کہہ کر نوہرے کی طرف چل پڑا۔

تب منشیرمال نے انٹی سے ساٹھ روپے کے نوٹ نکال کر باقر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ابھی یہ رکھو، باقی بھی ایک دو مہینے تک پہنچا دونگا۔ ہوسکتا ہے تمہاری قسمت کے پہلے ہی آجائیں۔ اور بغیر کوئی جواب سنے وہ نوہرے کیطرف چل پڑے۔ تورا پھر چارہ کترنے لگا تھا۔ دورہی سے آواز دیکر اُنہوں نے کہا۔ بھینس کا چارہ رہنے دے، پہلے ڈاچی کے لئے گوارے کا نیرا کر ڈال، بھوکی معلوم ہوتی ہے۔

اور پاس جاکر سانڈنی کی گردن سہلانے لگے۔

کرشن پکش کا چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ویرانے میں چاروں طرف کہاسا چھایا ہوا تھا۔ سر پر دو ایک تارے جھانکنے لگے تھے۔ اور ببول اور واکا کے درخت بڑے بڑے سیاہ دھبے بن رہے تھے۔ ساٹھ روپے کے نوٹوں کو ہاتھ میں لٹکائے، اپنے گھر سے ذرا فاصلہ پر ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا باقر اس مدھم ٹمٹماتی روشنی کی شعاع کو دیکھ رہا تھا جو سرکنڈوں سے چھن چھن کر اس کے گھر کے آنگن سے آرہی تھی۔ جانتا تھا رضیہ جاگ رہی ہو گی۔ اس کی انتظار کر رہی ہو گی۔ اور وہ یہ سوچ رہا تھا کر روشنی بجھ جائے، رضیہ سو جائے تو وہ چپ چاپ گھر میں داخل ہو!

لاہور

جنوری ۱۹۳۵ء

شہر پاپیائی کے لوگ، سنا جاتا ہے، انسانوں اور شیروں کو
لڑا کر حظ اٹھایا کرتے تھے۔

پاپیائی غرق ہو گیا۔

لیکن کیا دنیا میں آج ایسے تماشائیوں کی کمی ہے؟

موٹریں اڈے پر آ کر رکیں۔ قلیوں کی دنیا میں ہل چل مچ گئی۔ بیٹھے کھڑے ہو گئے۔ کھڑے دوڑ پڑے جیسے سونے کی برکھا ہوئی ہو، کوئی آسمانی نعمت ان کے درمیان آگری ہو۔ پل کے پل میں میلے کچیلے، بوسیدہ کپڑے پہنے، بیسیوں قلی موٹر کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اکثر نے اپنے پیتل کے نمبر بھی موٹر میں پھینک دیئے۔

موٹر میں بیٹھے ہوئے مسٹر والٹن اور ان کا کنبہ پیتل کے ٹکڑوں کی اس بارش سے گھبرا اٹھا۔ دوسرے لمحے مس والٹن تنک کر موٹر میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی جوان آنکھوں میں غصے کے ڈورے دوڑ گئے۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ اس

نے سب نمبروں کو اٹھایا اور قُلیوں کے منہ پر دے مارا۔ ایک پنسل کا نمبر والٹن صاحب کی گود میں پڑا تھا۔ اسے اُٹھاتے ہوئے مس والٹن نے جونہی پھینکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ ایک خوشرو اور وجیہہ قلی دوسروں کو ہٹاتے ہوئے مس والٹن کے سامنے آکھڑا ہوا ۔ کچھ بے پرواسا۔ کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا۔ کچھ مغموم سا۔ جیبنہ کی غضبناک آنکھیں قلی کی حسرت بھری آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اس نے نمبر نہیں پھینکا اور اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ قلی اور نزدیک آکر موٹر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ صاحب اپنی بیوی کو ساتھ لے کر دوسرے دروازے سے اتر گئے۔

مس والٹن نے سر سے پاؤں تک قلی کو دیکھا۔ اور پھر دور تک نگاہ دوڑائی ان چیتھڑوں میں لپٹے، نیم برہنہ ٹانگوں اور ننگے بازوؤں والے وحشی صفت قلیوں میں، جو پاؤں میں سیر ڈیڑھ سیر کی چپل پہنے ہوئے تھے۔ اور جن کے گھٹنوں تک میل کی جرابیں چڑھی تھیں، جن کے چہروں پر حسرت اور غریبی برستی تھی۔ اور جن کی آنکھوں کے پپوٹے گرد سے سیاہ ہو گئے تھے۔ کون اس جیسا بہادر کون اس جیسا دلیر۔ کون اس جیسا خوبصورت تھا؟ اس نے دیکھا نوجوان قلی کے گورے گورے بازوؤں پر محنت اور مشقت کی وجہ سے مچھلیاں پڑ گئی ہیں۔ اور ان میں نیلی نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں۔ اس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی۔ گلے میں کرتا تھا۔ لیکن آستین اور گریبان کی قید سے آزاد!

"تمہارا نام"؟

"۳۴۲"!

"نمبر نہیں نام"؟

"حیدر"!

"حیدر"! اور پھر پوچھا —

"کتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے"؟

"بہت کافی مس صاحب"!

ڈرائیور نے دروازہ کھولا مس والٹن کھٹ کھٹ نیچے اتر گئی۔

"وہ پیانو اٹھا سکتا؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

حیدر نے اس طرف نگاہ دوڑائی اور پھر چہرے سے بالوں کی خشک لٹوں کو پرے ہٹایا۔ ٹرک* میں ایک بڑا سا پیانو رکھا تھا۔ اور چار پانچ قلی اسے نیچے اتارنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

اس نے جواب دیا "ہاں اٹھا لوں گا"۔

یہ جواب دیتے ہوئے اسے پیانو کے وزن کا دھیان آیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر کی بے بسی کی تصویر کھنچ گئی۔ اور پھر اسے اپنے قول کا بھی خیال آیا۔ جب ہاں کر دی۔ پھر نہ کیسی؟ کیا انکار کر کے اب اس ماہ جبیں کی نظروں میں کمزور بننا اسے منظور ہو گا؟ نہیں! اور وہ آگے بڑھا۔

سریلے گیت گانے والا پیانو جس کے لئے مس والٹن ایک علیحدہ کمرہ ریزرو رکھا کرتی تھی اتار کر زمین پر رکھ دیا گیا۔ اور دو تین ہاتو[1] اسے اٹھانے کے لئے تیار ہوئے۔

"اسے یہ قلی اٹھائے گا" مس والٹن نے آگے بڑھ کر کہا۔

---

[1] کشمیر اور ناہمن کے قلیوں کو ہاتو کہتے ہیں۔ * اسباب اٹھانے والی موٹر۔

صاحب نے حیدر پر سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور حیرت سے بولے "اکیلا"؟

"ہاں"! اور مسکراتے ہوئے حیدر کی طرف دیکھ کر مس والٹن بولی "کیوں اٹھائے گا اکیلا؟ ہم اینام بی ڈیگا"

حیدر کا سینہ پھول اٹھا اس نے کہا "ہاں مس صاحب"

"ٹین مائل جائے گا"

"لے جاؤں گا"

"ہم تو میں بہوت اینام ڈے گا" اور مس والٹن کی مشتاق نگاہیں اس قلی پر جم گئیں۔ دیکھتے دیکھتے حیدر نے پیانو کے گرد رسا لپیٹ لیا۔ جو "ہاتو" اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ دو آدمیوں کی مدد سے حیدر نے پیانو پیٹھ پر لاد لیا۔ اس کی کمر دوہری ہو گئی۔ پیشانی پر پسینہ آگیا۔ اپنی چھوٹی سی لٹھیا کے سہارے وہ چل پڑا۔

"مر جائے گا سسرا" ایک ہاتو نے کہا۔ پوں پوں کرتی ہوئی دوسری موٹر گاڑی آکھڑی ہوئی اور سب اس کی طرف دوڑ پڑے۔

مس والٹن وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اتنا بڑا پیانو جسے چار آدمی مشکل سے اٹھا سکیں اس اکیلے حیدر نے اٹھا لیا۔ یہ یورپ میں ہوتا تو بوجھ اٹھانے کا ریکارڈ رکھ کر ہزاروں روپیہ کما لیتا۔ اس کے نوجوان دل میں اس قلی کے لئے ہمدردی کا سمندر موجزن ہو اٹھا۔ لیکن یہ ہمدردی اس کی حسرت بھری آنکھوں، اس کے مغموم چہرے، اس کے بوسیدہ لباس، اس کی لاچاری،

اس کی بے بسی کو دیکھ کر پیدا نہیں ہوئی۔ وہ اس فرقہ سے تعلق رکھتی تھی جہاں یہ باتیں ہمدردی خریدنے کی بجائے نفرت مول لیتی ہیں۔ لیکن بہادر کے لئے خوبصورت کے لئے اُنس پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے اور پھر نوجوان عورت کے دل میں! —— وہ دل چاہے کسی انگریز عورت کا ہو، یا کسی ہندوستانی نازنین کا۔

رکشا اس کے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ والٹن صاحب نے تین رکشاؤں کے لئے آرڈر دیا تھا مس والٹن سب سے پہلی رکشا میں بیٹھ گئی۔ دوسری میں اس کی ماں اور سب سے آخری رکشا میں صاحب خود بیٹھے۔ بہان سات قلی دوسرا سامان اٹھا کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

والٹن صاحب ریٹائرڈ انجنیر تھے۔ پنشن ملتی تھی کنبہ بھی بہت بڑا نہیں تھا۔ مزے سے بسر ہو تی تھی۔ شملہ میں انہوں نے دو تین کوٹھیاں بنوا لی تھیں۔ کرایہ بھی آ جاتا تھا۔ ان کی اپنی کوٹھی کا نام "کینمور کاٹیج" تھا۔ چھوٹے شملے سے ذرا دور ایک دیدہ زیب جگہ پر بنی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے سامنے باغیچہ تھا۔ فرصت کا وقت والٹن صاحب اس میں طرح طرح کے پودے لگانے میں صرف کرتے تھے۔ انہیں اس میں بڑا آنند ملتا تھا۔ کبھی کبھی ان کی لڑکی بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ اسے اپنے نقش قدم پر چلتے دیکھ کر والٹن صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ یوں تو ایک مالی بھی رکھا ہوا تھا۔ لیکن اس کا کام زیادہ تر سردیوں میں باغیچے کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ گرمیوں میں صاحب خود دہلی سے آ جاتے۔ تب ان کا کافی وقت

ان کے باغیچے ہی میں گزرتا مس والٹن کو پیانو بجانے میں کمال حاصل تھا۔ جہاں ایک دو مہینوں کے لئے جانا ہوتا۔ وہیں اسے لے جاتی۔ یہ پیانو خاص طور پر اس نے ولایت سے منگایا تھا۔ عام پیانو سے تگنا بڑا۔ سریلا اتنا کہ جب مس والٹن کی ملاحت بار آواز اسکی آواز سے مل جاتی تو گویا سونے پر سوہاگہ ہو جاتا۔ فضا کے ذرّے ذرّے میں ایک حیات آفریں نغمہ بس جاتا۔ سننے والے بت بن جاتے اور انھیں ماضی یا مستقبل کی کوئی خبر نہ رہتی۔

حیدر سانس لینے کے لئے رُکا۔ شملے میں سڑکوں کے کنارے سیمنٹ کے چبوترے بنے ہوتے ہیں۔ تاکہ قلی لوگ وہاں بوجھ رکھ کر ستا لیا کریں مس والٹن اپنے خیالات میں محو تھی۔ حیدر کو رُکتے دیکھ کر رکشا سے کود پڑی۔ صاحب اور اس کی بیوی اس سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اس نے حیدر سے کہا ”کیوں تھک گیا۔ بولا تھا مت اٹھاؤ۔ تم تھک جائے گا۔ لیکن مانا نہیں!“

حیدر ستائے بغیر پھر چل پڑا۔ کسی حسینہ کے سامنے تھکنے کا نام لینا اور پھر بہادری کا دم بھرنا!

”شاباش!“ مس والٹن اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی ”اگر تم آرام کئے بغیر اسے بنگلہ تک لے گیا تو ہم تم کو بہوٹ اینام ڈے گا۔ جو مانگے گا وہ ڈیگا“

بائیں ہاتھ میں لٹھیا پکڑ کر اس کے سہارے رُک کر حیدر نے دائیں ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور چل پڑا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہوتے جاتے تھے۔ اس کے ماتھے سے پسینہ بہ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک کبھی

اتنا بوجھ نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن مس صاحبہ خوش ہو گئی تھیں۔ اگر وہ اس پیانو کو وہاں تک پہنچا دے گا۔ تو ضرور ہی وہ اسے دو تین روپے انعام دے دیں گی۔ ہو سکتا ہے اسے اپنے ہاں نوکر ہی رکھ لیں۔ پھر تو اس کی زندگی بن جائے۔ وہ آمنہ کو سکھ دے سکے۔ اپنی اسی پیاری آمنہ کو جس نے اس کے لئے امیری سے غریبی مول لے لی تھی۔ اپنے متمول والدین کو چھوڑ کر عیش و عشرت پر لات مار کر اس کے ساتھ ہو لی تھی۔ جو اس سے محبت کرتی تھی اسے سب یاد تھا ـــــ وہ دن جب لاہور میں سٹیشن سے سامان اٹھا کر وہ ایک گلی کے بڑے سے مکان میں لے گیا تھا۔ اور جب برقعہ کو اٹھا کر حشر برپا کر دینے والی دو آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے یاد تھا۔ کس طرح وہ آنکھیں اس پر مہربان ہو گئی تھیں۔ کس طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے محبت کا پیغام ملا تھا۔ کس طرح اس نے قلی کا کام چھوڑ کر اس گلی میں پان کی دکان کر لی تھی۔ کس طرح آمنہ اس کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔ اور کس طرح اسے قید و بند کی مصیبتوں سے بچانے کے لئے اس نے بھری عدالت میں اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عہد کیا تھا۔ سب یاد تھا۔ وہ دن، وہ راتیں۔ وہ گھڑیاں، وہ پل۔ محبت کے پیار کے۔ صبر کے سپنوں کے ـــــ کل کی بات کی طرح یاد تھے۔ وہ کماتا تھا۔ آمنہ کو سکھ دینے کے لئے۔ اپنی اسے کچھ پروا نہ تھی۔ وہ سوچتا۔ اگر میرے پاس کچھ روپیہ ہوتا۔ کچھ تھوڑا بہت ہی تو پھر آمنہ کو لے کر دور کسی چھوٹے سے قصبہ میں ایک دکان کر لیتا۔ لیکن روپیہ آتا کہاں سے۔ آمنہ کے ساتھ بھاگنے کے بعد اس کی رہی سہی

پونجی بھی اڑ گئی تھی۔ اور مجبور ہو کر اسے پھر مزدور بننا پڑا تھا۔ وہ دن میں دو روپیہ کما لیتا تھا۔ اس کے جسم میں طاقت تھی۔ بازوؤں میں قوت تھی کشمیر اور ناہن کے ہاتو بھی اسے بوجھ اٹھاتے دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ آمنہ کہتی "مجھے تمہارے ساتھ سوکھی روٹی پسند ہے۔ تم بہت تکلیف نہ کیا کرو۔" لیکن وہ اس کی باتوں پر کان نہ دھرتا تھا۔ اسے ایک ہی دُھن تھی۔ ایک ہی لگن تھی۔ کچھ روپیہ پیدا کرنا، اور بس۔ اس کے بعد وہ اس پیشہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے گا۔

آمنہ اس کے کپڑے دھو دیتی تھی۔ جب وہ شام کو تھک کر آتا تو اس کے پاؤں دباتی۔ ہزاروں خرچ کرنے پر بھی ایسی نیک بخت بیوی نہ ملتی۔ لیکن وہ اسے پا کر بھی سکھی نہ تھا جب وہ دیکھتا کہ آمنہ اس اندھیری سی کوٹھڑی میں سارا سارا دن بند رہنے سے زرد ہوتی جا رہی ہے تو اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ وہ اسے شیش محلوں میں، سنگ مرمر کے عالی شان ایوانوں میں بیش قیمت ریشمی لباس میں ملبوس رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے یہ ارمان اُس طائر بے بال و پر کی حسرتوں کی مانند تھے جو پہاڑ کی چوٹی سے عمیق کھڈ میں گر پڑا ہو اور پھر اوپر پرواز کرنا چاہتا ہو۔

حیدر نے لمبا سانس لیا۔ اس کا سینہ درد کرنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت جب وہ بوجھ اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ آمنہ بھی کوئی نہ کوئی کام کرتی ہو گی۔ اس نے غالیچے بنانا سیکھا تھا۔ دونوں کچھ روپیہ اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔ جس سے وہ کوئی کام شروع کر سکیں۔ انھیں پوری امید تھی۔ کہ اس سال

کے خانہ بدوان کے پاس کوئی چھوٹا موٹا بیوپار کرنے کے لئے مناسب رقم جمع ہو جائے گی۔

حیدر سوچ رہا تھا ــــ کون جانے یہ لڑکی اس سے خوش ہو کر اسے اپنے ہاں نوکر رکھ لے۔ اس صورت میں اس کی تمنّا بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ ابھی انہیں کمرے کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے اور خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ پھر روٹی اور رہائش کا غم نہ رہیگا۔ تھوڑا بہت سرمایہ جمع کر لینگے اور کسی چھوٹے سے قصبہ میں جا بسیں گے۔ وہ ہو اور آمنہ کی لازوال محبّت۔ اور بس۔ اسی طرح یہ زندگی کا ناٹک ختم ہو جائے۔

لیکن یہ پیانو وہاں پہنچ بھی سکے گا؟ اگر وہ سستا لیتا تو شاید پہنچا بھی دیتا لیکن بغیر سانس لیے تین میل ــــ چڑھائی کے تین میل! بالکل ناممکن ہے۔ موٹروں کے اڈّے سے سڑک پر آتے ہی اس کی جان قبض ہو گئی تھی اس کی قوت اسے جواب دے رہی تھی۔ اس نے سوچا پیانو کو رکھ دے۔ اسی وقت مس والٹن نے کہا "شاباش حیڈر شاباش! اگر تم پیانو کو بنگلے تک لے گیا تو بہوٹ اینام ڈیگا"

حیدر کے مردہ جسم میں پھر جان پڑ گئی۔ امید نے پھر آب حیات کا کام دیا۔ وہ پھر چل پڑا۔

مس والٹن رکشا کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ تیرہ۔ چودہ سال کا سن۔ نازک کمر جسم کے ساتھ چمٹا ہوا فراک۔ سرو قد۔ اونچی ایڑی کے بوٹوں کی وجہ سے اٹھے ہوئے چھوٹے پاؤں۔ گورے گورے بازو۔

تیکھے نقش۔ اس طرح چلی جا رہی تھی۔ گویا حیدر کو نہیں۔ اسے انعام جیتنا ہو۔ وہ سوچتی "اتنا بہادر بھی کہاں ؛ یہ شخص جہاں بھی جائے گا نام پائے گا۔ فوج میں بھرتی ہوتا تو اب تک کرنیل ہو جاتا۔ کرکٹ کی مشق کرتا تو کپتان بن جاتا۔ اتنا بوجھ ! اسے اٹھانا ہی کارے دارد والا معاملہ تھا۔ پھر اٹھا کر تین میل چلنا۔ اس نے حیدر کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔ وہ اسے اپنا سب کچھ دے دے۔ اس بہادر قلی پر نثار ہونے کے لئے اس کا نوجوان دل بے تاب ہو اُٹھا"

ایک صاحب تھے مسٹر براؤن مس والٹن کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ اسے خیال آیا۔ اگر ان کو یہ بیاتو اٹھانا پڑے تو کچومر ہی نکل جاتے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"شاباش جیڈر" اس نے حیدر کو رکتے دیکھ کر کہا اور پھر اپنے خیالات میں محو ہو گئی۔ کبھی کبھی کوئی مسافر حیدر کو اتنا بوجھ اٹھائے اور اس انگریز حسینہ کو اس کے ساتھ اس طرح جاتے دیکھ کر حیرت سے ایک لمحہ کے لئے کھڑا ہو جاتا اور پھر اپنی راہ چلا جاتا۔

چھوٹے شملہ کا ڈاک خانہ آ گیا تھا۔ حیدر کو ٹانگیں جواب دیتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اسے اپنے حواس گم ہوتے دکھائی دیئے ؛یس ! اس سے آگے اُس سے نہ جایا جائے گا۔ وہ اتنی دور تک بھی کیسے آ گیا۔ اسے اس بات پر ہی حیرت تھی۔ اس کے پاؤں بڑھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے جسم میں جان ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوئی جاتی ہیں۔ اسے اپنی امیدوں کے

سب قلعے مسمار ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔

اس وقت مس والٹن کی میٹھی۔کیف بھری۔زندگی بخش۔ملاحت بار آواز پھر سنائی دی "حیڈر تھک گیا۔بس ڈو فرلانگ۔اور ٹم جیت جائے گا"

لیکن حیدر نہیں ہلا۔

مس والٹن کو اپنے تصورات کی دنیا برباد ہوتی ہوئی دکھائی دی۔اگر حیدر یہ بازی نہ جیت سکا۔تو وہ سب عقیدت جو اس کے دل میں حیدر کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ہوا ہو جائے گی۔اس نے پھر ایک بار حوصلہ افزائی کے لہجہ میں کہا:۔

"حیڈر۔ہم ٹمھارے لئے سب کچھ کرے گا۔ٹوہیں آرمی میں بھرتی کرا ڈیگا ٹوہیں نوکر رکھ لے گا۔ٹوہیں پیار کرے گا۔ کپ اپ ۔کپ اپ" اور حیدر چل پڑا گویا مس والٹن کی آواز میں بجلی کا اثر ہو۔

بنگلہ آگیا۔مالی اور نوکروں نے دوڑ کر مس والٹن کا استقبال کیا۔ ایک نے حیدر کو بوجھ تلے دبے دیکھ کر اسے سہارا دینا چاہا۔حیدر نے سر کے اشارے سے اسے ہٹا دیا۔اسے بنگلہ تک آپہنچنے کا ایک مبہم سا احساس تھا۔ اب یہاں تک پہنچ کر وہ اپنے کئے کرائے پر پانی نہ پھیرنا چاہتا تھا۔وہ تیز چلنے لگا۔منزل کے نزدیک پہنچ کر مسافر کی رفتار تیز ہو جایا کرتی ہے۔

مس والٹن سیدھی اس کمرہ میں گئی جو پیانو کے لئے ریزرو تھا۔وہیں دوسرے نوکروں نے حیدر کی پشت سے پیانو اتروایا۔حیدر کسی فاتح کیطرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔اس کا چہرہ چمک اٹھا صاحب دوسرے کمرے میں سامان

رکھوا رہے تھے۔ مس والٹن نے نوکروں سے اُدھر اُن کا ہاتھ بٹانے کو کہا۔
اس لمحہ حیدر کا سر چکرایا اور وہ بیٹھ گیا۔

اپنے ریشمی رومال سے اس کے چہرے کو پونچھتے ہوئے مس والٹن نے جذبات کے زیرِ اثر اس کی گوری پیشانی کو چوم لیا اور ہینڈ بیگ سے بٹوا نکال کر بیس روپیہ کے نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ لیکن نوٹ گر پڑے مس والٹن نے شک کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ حیدر کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔

مس والٹن حیران سی بھونچکی سی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

اس وقت نوکر نے ایک پیتل کا ٹکڑا اندر پھینکا۔ "مس صاحبہ یہ نمبر رکشا ہی میں رہ گیا تھا" مس والٹن نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا "۳۲۴"۔ پُوُر حیدر (Poor Hydar) اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

رفاقت

لاہور
اپریل ۱۹۳۲ء

آسمان کی بلندیوں میں ساتھ ساتھ گھومنے والے سیّاروں میں سے ایک نے کہا ــ "میرے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں میں چلا" "بلندیوں میں جب ہم ساتھ ساتھ گھومے تو گہرائیوں میں ساتھ ساتھ کیوں چھوڑیں" ــ دوسرے نے کہا اور پہلے کی پیروی کی۔

کندن اور حامد کی رفاقت یہیں سے شروع ہوئی۔

چند ہفتوں سے کالج کی دنیا میں ایک ہیجان برپا تھا۔ لڑکے باغی ہو گئے تھے۔ لیکچر پر لیکچر ہوتے۔ ہڑتالوں پر ہڑتالیں ہوتیں۔ پروفیسر دن بھر دوڑ دھوپ کرتے۔ پرنسپل الگ مارے مارے پھرتے۔ انہوں نے یہ پودا اپنے خون سے سینچا تھا۔ اسے تباہی سے بچانے کے لئے وہ ہر قربانی کے لئے تیار تھے۔ لیکن قومی تحریک کا زور تھا۔ اگر تحریک کے خلاف لب کشائی کرتے ہیں تو رجعت پسند۔ قوم فروش۔ غدار وطن اور نہ جانے کیا کیا کہلاتے ہیں، بدنامی،

رسوائی اور ذلت کو دعوت دیتے ہیں۔ اگر خاموش رہتے ہیں، لڑکوں کے جذبات ابھرنے دیتے ہیں، تو اس پودے کی جڑوں میں درانتی چلانے کا موجب بنتے ہیں — ابھی اس سال ہی توڑ گری کی جماعتیں جاری ہوئی تھیں۔ حکام کیا خیال کرینگے، امراء اور افسروں کی امداد جاتی رہے گی۔ نئی پود میں باغیانہ خیالات الگ پھیلیں گے۔ آئندہ داخل ہونے والے طلبا پر اقتدار الگ جاتا رہے گا۔ سب کالج کے ممبر اس برے وقت کو ٹالنے کے لئے دست بدعا تھے۔ سب اس بلا سے رہائی پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن طلبا کا جوش تھا۔ کہ دریا کی طرح بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جس میں پرنسپل کی مساعی، پروفیسروں کی کوششیں خس و خاشاک کی طرح بہی جاتی تھیں جس طرح چھوٹا بچہ بڑی محنت سے بنائی ہوئی کاغذ کی ناؤ کو، پانی میں ڈوبتے دیکھ کر کنارے پر کھڑا ہاتھ ملتا ہے۔ اسی طرح پرنسپل صاحب اس قومی جوش کے دریا میں کالج کو غرق ہوتا دیکھ رہے تھے۔

تحریک کے شروع ہی میں طلبا نے اس میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ قومی جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوتے۔ قومی سرگرمیوں میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیتے۔ اور ہفتہ بھر میں جو خیالات ان کے دل میں جمع ہوتے۔ انہیں کالج یونین کے ہفتہ وار اجلاس میں نکال دیتے۔ کوئی پروگرام ہو۔ مناظرہ، مشاعرہ، مضامین۔ افسانے سب کو وہ قومی جذبات کے رنگ میں رنگ دیتے۔ بحث کے لئے خشک سے خشک موضوع رکھے جاتے۔ غیر سیاسی مضامین ڈھونڈے جاتے۔ لیکن طلبا کسی نہ کسی طرح اس میں

سیاسیات کو لا گھسیڑتے۔ پرنسپل کا دل خوف سے دہل اٹھتا اس خیال سے کہ طلبا ان کی توہین نہ کریں۔ وہ سرکاری افسروں کو مدعو نہ کرتے۔ پہلے ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی افسر، کوئی نہ کوئی عہدیدار۔ کالج کی نئی عمارت کو دیکھنے کے لیے آ جاتا تھا۔ پرنسپل صاحب بڑے شوق سے اسے کمروں کی سیر کراتے۔ اس وقت ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا۔ لیکن اب اگر کوئی سرکاری افسر کالج کو دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کرتا۔ تو ٹال جاتے۔ اس غیر مرکزی مقام میں لاہور کی شان دکھانے کے لیئے انہوں نے افسران تعلیم کو مدعو کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ لیکن اب اس ارادے کی تکمیل ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ بیسیوں تدابیر کیں۔ یونین کے پروگرام میں تبدیلیاں کر دیں۔ سب دلچسپیاں ترک کر دیں۔ اب صرف پروفیسروں کے لیکچر ہوتے۔ یا خشک مباحثے اور ان میں بھی پروفیسر ہی حصہ لیتے۔ مگر طلبا ٹھہرے دوسرے شیطان۔ بحث اور لیکچروں کے دوران میں ایسے سوالات کرتے۔ کہ پروفیسروں تک کو سیاسیات پر بحث کرنا پڑتی۔ آخر تنگ آکر پرنسپل نے یونین کو بند کرنے کا حکم دے دیا۔ نہ رہے گا بانس۔ نہ بجے گی بانسری۔ یونین کے بند ہونے ہی طلبا کے سیاسی خیالات اندر ہی اندر جڑ پکڑنے لگے۔ پہلے دلوں میں جو جذبات پیدا ہوتے انہیں لڑکے یونین کے ہفتہ وار اجلاس میں نکال دیتے۔ ان پر عمل نہ ہوتا۔ لفظی بحث و تمحیص کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا۔ اب جو خیالات اٹھتے۔ وہ لوحِ دل پر نقش ہو جاتے۔ طلباء ان پر عمل کرنے کی سعی بھی کرتے۔ زخم کے بند ہونے سے مواد اندر ہی اندر جمع ہونے لگا تھا۔ چنانچہ خفیہ جلسے۔ خفیہ لیکچر۔ اور خفیہ مباحثے ہونے لگے۔

انہی دنوں میں کندن نے کالج کی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ وہ لاہور کے ایک کالج سے آیا۔ آزادی کے دن دیکھ چکا تھا۔ اس نے کہا۔

”کالج کے منتظمین نے سراسر ظلم پر کمر باندھ لی ہے۔ تقریر و تحریر کی آزادی کے لئے دنیا میں ہزاروں قربانیاں کی گئیں۔ لاہور میں طلبا کو ہر طرح کی آزادی ہے تفریحی جلسوں میں پروفیسر تو کیا پرنسپل تک کا مضحکہ اڑا دیا جاتا ہے۔ لیکن کوئی چوں تک نہیں کرتا۔ سٹوڈنٹ یونین کے جلسوں میں طلباء اپنی شکایات پیش کرتے ہیں اور درسگاہوں کے منتظمین کی طرف سے ان پر ہمدردانہ غور کیا جاتا ہے۔ یہاں زبان ہلانے پر اسے کاٹ لینے کی کوشش کی جاتی ہے گویا ہم انسان نہیں بے زبان جانور ہیں۔“

طلباء نے کندن کی تقریر کو سنا۔ اس کی باتوں پر غور کیا۔ ان میں صداقت کی بو آتی تھی۔ چنانچہ تجویز ہوئی کہ علیحدہ یونین منظم کی جائے۔ ایک دو نے تائید کی۔ تجویز پاس ہو گئی۔ رکا ہوا پانی بندھ کو توڑ کر بہہ نکلا۔ کالج کے خلاف چند شکائتیں بھی پیدا ہو گئیں۔ یونین بند ہو گئی ہے اس کا چندہ اب تک لیا جاتا ہے۔ طلباء گرمیوں کی تعطیلات میں سائیکل شیڈ کا چندہ دینے کو تیار نہیں طلباء کے لئے خالی اوقات میں بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں۔ لائبریری میں امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ امتحانات کو ملتوی کر دیا جائے۔ اس قدر گرمی میں امتحان دینا وبال جان ہے۔

کندن نے ممبری کے فارم اور شکایات چھپوا لیں۔ اور انہیں طلباء میں تقسیم کر دیا۔ یونین کے ممبروں کی تعداد بڑھنے لگی طلباء کی اکثریت امتحان ملتوی کرانے

کے حق میں تھی۔ جس کسی نے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ اس کا مضحکہ اڑایا گیا۔
پرنسپل صاحب نے اِن فارموں اور شکایات کو دیکھا۔ کندن لال یونین کے
سیکرٹری تھے۔ چنانچہ انہیں پر عتاب نازل ہوا۔ غصے میں تدبّر کا خاتمہ ہو جاتا
ہے جھٹ پچاس روپے جرمانہ کر دیا اور کالج سے نکل جانے کی دھمکی دی۔

طلباء یہ حکم سنتے ہی کلاسوں سے باہر نکل آئے لیکن پانسہ الٹا پڑا۔ بائیکاٹ
مکمل نہ ہوا۔ مسلمان طلباء اور چند دوسرے محنتی اور غریب طالب علم جن کی فیس معاف
تھی۔ وہیں بیٹھے رہے۔ کندن کو شکست ہوئی۔ پرنسپل نے سب کو دو دو روپیہ
جرمانہ کر دیا۔ کندن خون کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ طلبا خاموشی سے کلاسوں میں
آ بیٹھے۔ لیکن دلوں میں لگی ہوئی آگ اندر ہی اندر سلگنے لگی۔ خفیہ پروپیگنڈا
جاری رہا۔

مہاتما گاندھی دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آ رہے تھے۔ ادھر
ہندوستان میں وائسرائے نے آرڈیننس نافذ کر دیا تھا۔ لیڈر اُدھر
گرفتار ہو رہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی گرفتاری پر لاہور کے تمام کالج
بند ہو گئے تھے۔ لیکن کندن ایک دفعہ شکست کھا چکا تھا۔ اب کلنک کا ٹیکا
اپنے ماتھے نہ لگانا چاہتا تھا۔ اب جو قدم اٹھے متحدہ طور پر اٹھے۔ اب کے جو ہڑتال
ہو مکمل ہو۔ ایک بھی طالب علم کلاس میں نہ رہے۔

اتفاقاً موقع بھی ایسا آ گیا۔ مہاتما گاندھی گرفتار کر لئے گئے۔ کندن نے
ہڑتال کا فیصلہ کر دیا۔ مسلمان طلبائ کے لیڈر حامد کو راہ پر لانے کا بار اپنے ذمہ لیا لیکن پرنسپل
کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ اُنہوں نے کندن کو حامد سے ملنے کا موقع ہی نہ دیا۔

ٹائم ٹیبل کے مطابق کلاس میں انگریزی کے پروفیسر کو آنا تھا لیکن وہ خود جماعت میں آدھمکے۔ ان کے رعب سے لڑکے کلاسوں میں ہی رہیں گے، اس بات کا انہیں یقین تھا۔ ان کی موجودگی میں کندن زہر نہ پھیلا سکے گا۔

کندن نے کام بگڑتے دیکھا۔ تو اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مختصر سے الفاظ میں دنیا کی اس عظیم اور برگزیدہ ہستی کے محبوس کئے جانے پر تقریر کی۔ اور آخر میں اس نے طلباء سے اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے اپیل کی۔ اور کتابیں اٹھالیں۔ اس کے اٹھتے ہی تمام طلباء اٹھ کھڑے ہوئے۔

پرنسپل صاحب نے امید بھری نگاہوں سے حامد کی طرف دیکھا۔ ڈوبتے نے تنکے کا سہارا پکڑنے کی کوشش کی۔

"آپ ہمیں قوم فروش نہ سمجھئے" حامد نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔ پرنسپل صاحب کے ہاتھ سے آخری سہارا بھی جاتا رہا۔ اس کے آگے وہ کچھ نہ سن سکے خاموشی سے باہر نکل آئے۔

کندن نے دوڑ کر حامد کو گلے لگا لیا۔

رفاقت کی زنجیر میں یہ پہلی کڑی تھی۔ اس کے بعد حامد حامد اور کندن کندن نہ رہا۔ دونو ایک جان دو قالب ہو گئے۔ مذہب کا خیال۔ جس دوئی۔ نفرت اور تعصّب کو پیدا کرتا ہے۔ اسے محبت اور ہم خیالی نے مٹا دیا۔ اور اس کی جگہ اخوت اور یگانگی نے لے لی۔

طلباء کالج کے باہر اکٹھے ہو چکے تھے۔ کندن اور حامد بھی ہاتھ میں ہاتھ دیئے ان میں جا شامل ہوئے۔ کالج سے ایک بڑا زبردست جلوس شروع ہوا

آگے آگے کندن اور حامد تھے۔ ان کے پیچھے ہاتھ میں کتابیں لئے طلباء۔ اور اس کے بعد بائیسکل والوں کی ایک لمبی قطار۔۔۔ یہ جلوس قومی گیت گاتا ہوا قومی نعرے بلند کرتا ہوا۔ بند بازاروں سے گذرا۔ ہڑتالی عوام اس میں شامل ہوگئے۔ پورے جوش سے نعرے بلند کئے گئے۔ دیش کے گیت گائے گئے تھے۔ اور پرنسپل کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔

(۲)

حامد افسردہ سا کالج کے باہر نکلا۔

کندن نے اس کا بازو تھام لیا۔ اگر حامد نہیں۔ تو کندن بھی نہیں۔ دونو ایک ہی تیر کے شکار تھے۔

کسی بڑی بھاری سلطنت میں اٹھی ہوئی چھوٹی سی بغاوت کی طرح کالج کی یہ ننھی تحریک ختم ہوچکی تھی۔ تین ماہ کی تعطیلات میں طلباء امتحان کی تیاریوں میں مصروف رہے تھے۔ امتحان کے خوف سے ان کا سیاسی جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ گھروں میں اکٹھے بیٹھنے، بحث وتمحیص کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ تعطیلات ختم ہوتے ہی امتحان شروع ہوگئے۔ اور سب سرگرمیوں کو ترک کرکے طلباء ان میں منہمک ہوگئے۔

امتحان ختم ہوئے تو وہ امید وبیم کی حالت میں نتائج کا انتظار کرنے لگے۔ یہ آخری امتحان تھا۔ اور اس کے نتائج کی بنا پر طلباء کو فورتھ ایئر میں ترقی دی جاتی تھی۔ اب پرنسپل کی باری تھی۔ انہوں نے فیل شدہ طلباء کو قرار واقعی سزا دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جو ایک مضمون میں بھی فیل ہوا۔ اس کا

داخلہ روک لیا گیا۔ یونین کے محرکوں سے تو ذرا بھی رعایت نہیں کی گئی۔ نتیجہ سناتے وقت پرنسپل صاحب خود کلاس میں آئے اور ایک شانِ خود نمائی سے کرسی پر آ بیٹھے۔ ان کے پیچھے کلرک ہاتھ میں رجسٹر لیے ہوئے داخل ہوا۔ نتیجہ سنا گیا۔ کندن علالت کی وجہ سے حساب کے ایک پرچہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس کو حساب میں فیل قرار دیا گیا۔ حامد کے لیکچر اردو میں کم تھے۔ لہٰذا اس کی ترقی روک لی گئی۔ نتیجہ سناتے وقت پرنسپل نے فاتحانہ انداز میں دونوں کی طرف دیکھا۔ لیکن شکست انہوں نے بھی قبول نہ کی اور اٹھ آئے۔

دونوں اکٹھے کالج کے دروازے سے نکلے۔ اور بازو میں بازو ڈالے آہستہ آہستہ کولتار کی سڑک پر چلنے لگے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ اور دور دو رویہ شیشم کے درخت ایک کیف کے زیر اثر جھومنے لگے۔ دو جنگلی کبوتر کہیں سے اڑ کر ٹیلیفون کی تاروں پر جا بیٹھے۔ اور پھر وہاں سے اکٹھے آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر گئے۔

حامد نے لمبا سانس لیا۔ اور کہا "کندن میں نے تو اس کالج میں دوبارہ نہ داخل ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

"آخر کوئی کالج میں داخل ہو بھی تو کیوں"؟ کندن بولا "تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ ریاضی میرا خاص مضمون ہے۔ ایف اے میں وظیفہ لے کر پاس ہوا ہوں۔ باقی طلبا کو تو جانے دو۔ پروفیسروں تک سے ریاضی میں بھڑ سکتا ہوں۔ پرنسپل خود اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے مجھے فیل کر دیا۔ میں نے سیاسی تحریک میں حصہ لیا اور ان کا مخالف رہا لیکن

اس کا یہ مطلب تو نہیں۔ کہ میرے ساتھ بے انصافی کا سلوک کیا جائے؟"

"اور میرے ساتھ کونسا انصاف ہوا ہے۔ منظور کے انگریزی میں بیسیوں لیکچر کم تھے لیکن ذرا ان کے والد آئے۔ سب غیر حاضریاں حاضریوں میں بدل گئیں۔ اور مجھے اردو جیسے اختیاری مضمون میں چند لیکچر کم ہونے پر روک لیا گیا۔"

کندن بولا۔ "خیر تم نے صرف اس کالج میں ہی داخل نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تو اس تعلیم ہی کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر چکا ہوں آخر ایسی تعلیم سے کیا فائدہ، جو غلامی کے سوا کچھ نہ سکھائے۔ کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے انگریزی میں اقتصادیات، فلسفہ اور سائنس تو دور رہے سنسکرت اور فارسی تک کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے۔ پھر اس زبان میں حاصل کی ہوئی تعلیم سے جتنا حقیقی فائدہ ہوگا وہ تم بھی جانتے ہو۔ اور میں بھی۔ ہاں کلرک بننا ہو تو بات دوسری ہے!"

چوراستہ آ گیا تھا۔ دونوں باتیں کرتے کرتے تار کے کھمبے کے نزدیک کھڑے ہو گئے۔ حامد نے ہاتھ پھیلا کر کھمبے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "تو کیا ارادہ ہے؟"

"میں تو پوری روٹی کا طالب ہوں آدھی پر قناعت کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ اتنی آزادی سے میرا پیٹ نہ بھریگا۔ میں مجلسی۔ سیاسی۔ مذہبی سب طرح کی آزادی چاہتا ہوں اور کل سے میں اس کے لئے جدوجہد شروع کر دونگا۔ لیکن تم۔"

"انشاء اللہ میں بھی۔"

"خدا حافظ!"

"خدا حافظ!"

اور دونوں دوست اس پر شور کارخانے میں ایک ہی کل کے پرزے بن کر کام کرنے کا عہد کر کے جدا ہو گئے۔

(۳)

کندن کی شمولیت نے شہر کی کانگرس کمیٹی میں نئی جان ڈالدی۔

اس وقت سٹی کانگرس کمیٹی ایک لاوارث بچہ کی حالت میں تھی۔کندن اس کا وارث بن گیا۔اس نے اسے نئی زندگی بخش دی۔اس وقت بڑے بڑے لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔کمیٹی کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔کارکن بھی سیاسی سرگرمیوں سے منہ پھیر کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ گاڑی تھی لیکن گاڑیبان نہ تھا۔کندن گاڑیبان بنا اور گاڑی پھر منزل مقصود کی طرف چل پڑی۔

حامد بھی پیچھے نہ رہا۔وہ کندن کی طرح تقریر نہ کر سکتا تھا۔لسّان نہ تھا۔ لیکن عملی کام میں وہ کندن کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتا تھا۔جھجک اور تذبذب اس کی سرشت میں عنقا تھے۔ وہ مضبوط جسم کا بارعب نوجوان تھا۔ کندن کانگرس کمیٹی کا ڈکٹیٹر ہوا۔تو وہ والنٹیر کور کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ گاڑی میں دو بیل جت گئے۔اور اس کی رفتار میں آندھی جیسی تیزی آگئی۔

پھر پورے زور سے کانگرس کا کام شروع ہوا۔بکھرے ہوئے اکٹھے ہوئے۔ ڈھلمل یقین مستحکم ارادے سے کام کرنے لگے۔جلوس نکلے جلسے ہوئے

محلّے محلّے میں قومی پرچار کیا گیا اور تمام شہر پر حب الوطنی کا گہرا رنگ چڑھ گیا۔

حامد کی آواز میں جادو تھا۔ جب والنٹیر کور کے آگے آگے ہاتھ میں جھنڈا لئے ہوئے گاتا۔

"اساں نہیں ہارنا بھاویں ساڈی جان جاوے"۔

اور سب اس کی آواز میں آواز ملاتے۔ تو دوکانوں کی چھتوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں، بازاروں میں جمع تماشائی سب اسی نغمے کو الاپتے۔ دوکانوں کی اینٹیں تک نئی زندگی، نئے جوش اور نئے ولولہ کا احساس کرتیں۔

لیکن یہ سب پرانا پروگرام تھا۔ ایک بے جان لاش تھی جسے گھسیٹا جا رہا تھا۔ کندن جدّت پسند تھا۔ وہ نئی چیز چاہتا تھا۔ پرانی چیز چاہے کتنی بھی سودمند کیوں نہ ہو اس سے جی بھر جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے بھی کارکنوں کے سامنے ایک نیا پروگرام رکھا۔ دیہات سدھار کی سکیم پیش کی۔ اس نے کہا "ہندوستان شہروں میں نہیں دیہات میں بستا ہے۔ ہم شہروں میں مظاہرے کر کے اپنے مقصد کی تکمیل نہیں کر سکتے"۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ ماہ کے شروع میں دیہات پر چار کا کام شروع کر دیا جائے۔ والنٹیروں کے جتھے بھیجے جائیں۔

حکام نے سمجھا نوجوانوں کا جوش دودھ کا اُبال ثابت ہو گا۔ ذرا سی دھمکی سے کام چل جائیگا۔ کندن کے چیدہ چیدہ کارکنوں کو ایک ماہ کے لئے امتناعی نوٹس دیدیئے۔ لیکن اس سے کانگرس کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ پڑا۔ حکام کو معلوم ہو گیا یہ نئے لیڈر پرانے لیڈروں کی طرح نہیں ہیں۔ انہیں

شہرت اور عزت کا خیال نہیں۔ یہ لیڈری کے لئے کام نہیں کرتے کام کے لئے لیڈری کرتے ہیں۔ پہلے سانپ تھے لیکن ان میں زہر نہیں تھا۔ یہ بھی سانپ تھے۔ لیکن خوفناک اور زہریلے۔ انہوں نے اور زیادہ موثر کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

چنانچہ مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہی علی الصباح شہر کے تمام ناکوں پر پولیس متعین کر دی گئی۔ کندن نے یہ دیکھا۔ تو چار چار والنٹیروں کے جتھے بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

سوال اٹھا پہلے جتھے میں کون کون جائے۔ کندن نے کہا ہمیں جتھوں کو منظم کرنا ہے۔ ہم سب سے آخری جتھے میں جائیں گے۔

حامد بولا "پہلے جتھے میں ہمیں جانا چاہئے۔ اگر خود تماشا نہ بنیں گے تو تماشائی نہ آئیں گے۔ جوش پیدا ہونا چاہئے۔ فوج سے ہی سردار پیدا ہو جائیں گے"۔

کندن مان گیا۔ پہلے جتھے کی سرکردگی کندن اور حامد نے کی۔

لوگوں نے ان کے گلے میں ہار ڈالے۔ کندن نے قومی پرچم ہوا میں لہرایا۔ حامد نے بگل بجایا۔ پہلا جتھا روانہ ہو گیا۔ سڑک پر تماشائیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔

شہر کے باہر چو رستہ پر آ کر جتھا رک گیا۔ سٹی مجسٹریٹ پولیس کی ایک جماعت کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے۔ کندن اور حامد وہیں دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ لوگوں کا عظیم الشان ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ پل پل بعد قومی نعرے لگائے جانے لگے۔

سٹی مجسٹریٹ نے مجمع کو خلاف قانون قرار دیتے ہوئے اسے منتشر ہونے کا حکم دیا۔ لیکن اس کا حکم بہرے کانوں سے سُنا گیا۔ لاٹھی چارج کا حکم ہوا۔

پولیس کی لاٹھیوں میں حرکت ہوئی۔ لوگ بھاگے لیکن چند لمحے بعد پھر وہیں اکٹھے ہو گئے۔

یہ تماشا گئی رات تک ہوتا رہا۔ پولیس نے جھتے کو گرفتار نہ کیا۔ اس سے تحریک کو تقویت دینے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کندن اور حامد بھی وہاں سے نہیں ہلے۔ رضا کار وہیں ان کا کھانا لے آئے۔

چھوٹی سی ٹوکری میں روٹیاں رکھی تھیں اور ایک بڑے سے برتن میں دال تھی۔ چاروں اکٹھے کھانے لگے۔

کندن نے دال میں روٹی بھگو کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا "کیا مزہ ہے اس کھانے میں حامد!"

"بڑی بڑی دعوتوں میں میسر نہ ہوگا۔" حامد نے پانی کا لوٹا اٹھاتے ہوئے کہا۔

(۸)

تین چار مہینے گذر گئے۔

شہر میں قومی تحریک کا عملی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ اور فرقہ دارانہ تحریک کے لئے ماحول پیدا ہونے لگا۔ ان تین چار مہینوں میں کندن اور حامد کئی دفعہ گرفتار ہوئے۔ لیکن عدالت نے ہر دفعہ انہیں جرمانہ کر کے چھوڑ دیا۔ سیاسی کارکنوں کی جیبیں عموماً خالی ہوتی ہیں۔ ان کے پاس جرمانہ تو کیا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بھی پیسے نہیں ہوتے۔ لیکن حکام نے ان کا جرمانہ ان کے رشتہ داروں سے وصول کرنا شروع کر دیا۔ رضا کاروں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ اپنے تن من دھن کی قربانی تو کر سکتے ہیں۔ لیکن رشتہ داروں کے تن من دھن پر ان کا

کوئی اختیار نہیں تھا۔ چنانچہ جب ایک دو دفعہ فرقیاں ہوئیں تو قومی جوش ختم ہو گیا۔ اور کارکن۔ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

اس اثنا میں لاہور میں چھپن فیصدی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ کئی مسلمان ان میں شامل ہو گئے۔ جسے ایک دفعہ پبلک کاموں میں حصہ لینے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ قومی رضا کاروں میں سے بھی ایک دو چھپنیوں میں مل گئے۔ لیکن یہ تحریک رجعت پسندانہ تھی نیشنلسٹ مسلمان اس میں شامل نہ ہوتے۔ اس لیے جب احرار کی تحریک شروع ہوئی۔ تو چھپن فیصدی تحریک بالکل ختم ہو گئی۔

اس دوسری سلامی تحریک نے کانگرس کیمپ کو دو حصوں میں منقسم کر دیا یہ ایک خالص سیاسی تحریک تھی۔ مسلمان قانونی اکثریت کے طالب تھے۔ ان کے ارادے بلند تھے۔ لیکن سرکردہ لیڈروں کے گرفتار ہوتے ہی اس تحریک نے کچھ ایسی روش بدلی کہ ایک خالص فرقہ وارانہ تحریک بن گئی۔ مغل پورہ کالج ایجی ٹیشن کے بعد کشمیر ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں جس قدر فرقہ وارانہ زہر پھیلا پہلے کبھی نہ پھیلا ہو گا۔

اس تحریک کے دوران میں حامد بھی خاموش نہ رہ سکا۔ اپنی پارٹی سمیت احراریوں میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ سرخ قمیضیں پہنے۔ سرخ ٹوپیاں لئے سرخ جھنڈوں کے جلوس نکالے گئے۔ اور کشمیر کے لئے جتھے بھیجے جانے لگے۔

کندن نے آریہ سوراجیہ سبھا میں شمولیت اختیار کر لی۔ دونوں طرف سے پراپگنڈا شروع ہو گیا۔ دونوں نیشنلسٹ تحریکیں تھیں۔ دونوں کے افراد محبانِ وطن

تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے درپے تھیں۔

اس تمام فرقہ وارکشیدگی کا نتیجہ لاہور میں فسادات کی صورت میں رونما ہو گیا۔ اس فساد کا اثر یہاں بھی پڑا۔ چنانچہ دوسرے دن مسلمان ہندوؤں اور ہندو مسلمانوں سے بھڑ گئے۔ فساد کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ جارحانہ کارروائی کس نے کی۔ یہ معلوم نہیں لیکن فساد ہو گیا۔ ہندو مسلمانوں اور مسلمان ہندوؤں کو مجرم گردان کر افواہیں پھیلانے لگے۔

حامد اپنے کمرہ میں بیٹھا اخبار میں فسادات لاہور کی داستان پڑھ رہا تھا کہ اس کا چچا ہانپتا ہوا داخل ہوا۔

حامد یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ وہاں کندن نے تمہارے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ تمہیں لاکھوں بار سمجھایا۔ آستین میں سانپ نہ پالو۔ کافر سے دوستی نہ رکھو لیکن تم نے ایک نہ مانی۔"

حامد کرسی سے اچھل پڑا۔ "کون قتل ہوا"؟

"علی شبیر"

"علی شبیر"——حامد نے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی تلوار اٹھالی اور لپکتا ہوا باہر نکلا۔

بازار میں حامد ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے۔ دیوانہ وار بھاگا جا رہا تھا۔ اور اس کا چچا آستین میں خنجر چھپائے اس طرح دبکا چلا جاتا تھا جس طرح شیر کے پیچھے گیدڑ۔ یہی چچا تھا جس کی فرقہ داری کی وجہ سے حامد اسے حیوان کہا کرتا تھا۔ آج خود حیوان بنا ہوا تھا۔ اس کے چچا زاد بھائی کا خون ہوا در

وہ بھی اس کے دوست کے ہاتھوں۔ وہ ایسے دوست کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا۔

حامد نے دیکھا — علی نثیر کی نعش زمین پر پڑی ہے اور دونوں پارٹیاں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ جاتے ہی اس نے کندن کو گلے سے پکڑ لیا۔ "پاجی اگر وار کرنا تھا تو اس کے ہی بھائی پر جسے تم اپنا دوست کہتے ہو، بھائی سمجھتے ہو"

دوسرے لمحہ میں کندن کے جھٹکے سے حامد دو قدم پیچھے کھڑا تھا۔

"میں نے پہل نہیں کی ہے میں نے علی نثیر کو سمجھایا" کندن نے کہا۔

حامد نے ہوا میں تلوار گھمائی "بھیڑوں کی طرح دبلیں مت دوار بچاؤ"

کندن نے بھی شپ سے تلوار نکال لی۔

دونوں کے اس طرح تیار ہونے پر ہندو مسلمان پھر آپس میں جٹ گئے رکا ہوا طوفان پھر زوروں پر ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ دونوں کی تلواریں ایک دوسرے کے پہلو میں گھسیں۔ کندن کی ماں دونوں کے درمیان آکر کھڑی ہو گئی۔

"بھائی بھائی ہو کر لڑتے ہو شرم نہیں آتی"

حامد کی کھچی ہوئی تلوار گر گئی۔ لیکن کسی کا بھرپور ہاتھ اس کے سر پر پڑا اور وہ زمین پر لڑھک گیا۔

کندن نے تلوار پھینک دی دوسرے ہاتھ سے ماں کو پرے ہٹایا اور بیقرار ہوکر حامد کو اٹھانے کیلئے جھکا۔ حامد کے چچا نے خنجر اس کی پشت میں بھونک دیا۔

کندن کے منہ سے آہ نکلی، حامد نے موت کی انگڑائی لی۔ اور گرتے ہوئے کندن کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

امن کا طالب

کپورتھلہ
جولائی ۱۹۳۰ء

اونچے اونچے محلوں کی دلفریبی میں بدامنی کو مت ڈھونڈ!
ان تنگ و تاریک گلیوں میں جا، جنھیں بھوک، اور
مفلوک الحالی نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔

سیاہ لبادے والا بات بات کی آہٹ لیتا ہوا شہر کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔

اُجین کے اُونچے مکان آدھی رات کے سناّٹے میں ہمالیہ کی بلند چوٹیوں کی طرح کھڑے تھے۔ اور تاریکی اُنہیں ماں کی طرح اپنی گود میں چھپائے ہوئے تھی۔

چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں کوہستان کے تاریک درّوں کی طرح خاموش تھیں۔

اب وہ شہر کے گنجان حصے کو چھوڑ کر وہاں آگیا تھا۔ جہاں سے متوسط درجہ کے لوگ گذرنا بھی پسند نہیں کرتے۔

گلی میں، جس کے مکان پتھر کی بجائے مٹی کی ناہموار دیواروں کے بنے ہوئے تھے، کسی نے کہا

"پرماتما سنسار کو سُکھی رکھ"! اور پھر ایک لمبی سانس.....

لبادہ پوش چونک پڑا۔ ذرا اور آگے بڑھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔

"کون آہ بھر رہا ہے"؟

اس کے پاؤں کسی کے جسم سے ٹکرائے، وہ ٹھٹک گیا۔

قریب ہی سے کسی نے تھکی سی آواز میں جیسے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"پرماتما سنسار کو سکھی رکھ"۔

لبادے والے نے پوچھا۔ "کون ہے"؟ اب کے اس کی آواز ذرا اونچی تھی۔

—"سکھ کا متلاشی! — تم کون ہو"؟

"امن کا طالب" — لبادہ پوش نے کہا۔

"امن، سُکھ"! اور سُکھ کا متلاشی طنز بھری ہنسی ہنسا — "اِدھر امن، سکھ کہاں"؟

"میں بدامنی کی آماجگاہ ڈھونڈ رہا ہوں"

"تب تم ٹھیک جگہ پہنچ گئے ہو"۔

"کیا"؟

"یہیں بدامنی پیدا ہوتی ہے"

"یہاں"؟

"ہاں!"

اور لبادہ پوش کے پاؤں کے پاس ہی سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا، الف لیلے کی کہانیوں کے دیو کی طرح، اس کے کپڑے خستہ اور ردّی تھے۔ کچھ پیوند تھے کہ جن سے تن ڈھانپنے کا کام لیا گیا تھا۔ اس نے لبادہ پوش کی طرف دیکھا۔ اور اس تاریکی میں بھی لبادہ پوش کو اس کی آنکھیں جیسے لبادے کو چیر کر دل میں پیوست ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اس شخص نے لبادہ پوش کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اشارہ کیا اور بولا۔ "سمجھے"؟

"کیا"؟

"یہی بدامنی کی آماجگاہ ہے"

"یہ"؟

"ہاں!

"یہاں کون رہتے ہیں"؟

"اُجین کے مظلوم ترین لوگ"!

"مظلوم ترین لوگ ___ یعنی"؟

"محنت کرنے والے مفلس اور قلاش"۔

"محنت تو سبھی کرتے ہیں"۔

"لیکن سب مفلس نہیں یہاں وہ لوگ رہتے ہیں۔ جو محنت بھی کرتے ہیں۔ اور مفلس بھی ہیں۔ اِن کی محنت اُن عالیشان مکانوں کی صورت میں کھڑی ہے۔ اور خود وہ اِن خستہ گھروندوں میں رہتے ہیں۔ اُن مکانوں کے مکین بسیار خوری کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن خود انہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر نان میسر نہیں!"

لبادہ پوش خاموش رہا۔

اس نے اسے کندھے سے تھام لیا اور اسے گلی کے درمیان ایک دروازے تک لے گیا۔

"دیکھو!"

بوسیدہ دروازے کے سوراخوں سے لبادہ پوش نے آنکھیں لگا دیں۔

"دیکھا؟"

"ہاں!"

"کیا دیکھا تم نے!"

"ایک نحیف و ناتواں شخص کراہ رہا ہے اور ایک نوجوان اس کے جسم کو دبانے کی کوشش میں مصروف ہے!"

"اور دیکھو"

وہ اسے ایک اور دروازے تک لے گیا۔

مکان کی چھت گری ہوئی تھی۔ دروازہ برائے نام تھا اور گرے ہوئے مکان کے ملبہ کو ایک طرف کرکے بوسیدہ سا ٹاٹ بچھائے ایک ناتواں بڑھیا اس پہ بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔

وہ شخص لبادہ پوش کو پھر اسی مکان کے پاس واپس لے آیا، جس کے باہر وہ لیٹا ہوا تھا، اس کا دروازہ کھول کر وہ اسے اندر لے گیا۔

صحن میں وحشت چھائی ہوئی تھی۔ ٹوٹی سی کھاٹ پر ایک بچے کا پنجر پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر حسرت برس رہی تھی۔

"جانتے ہو یہ کون ہے؟" اس نے لبادہ پوش سے پوچھا۔

لبادہ پوش خاموش رہا۔

"یہ میرا بچہ ہے" وہ کہنے لگا۔ "یہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ جو اب تاریکی میں بدل چکا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے حاصل کرنے کے لئے لوگ سو سو منتیں مانتے ہیں، سو سو جادو جگاتے ہیں، دان کرتے ہیں، پُن کرتے ہیں اور جسے پاکر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ لیکن میں اسے پا کر بھی سکھی نہ ہو سکا اور اس کی موت پر اس کے لئے شمشان میں دو گز جگہ بھی حاصل نہیں کر سکا۔

مرحوم بچے کے سرہانے طاق پر ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جس کی مدھم سی روشنی بچے کی نعش پر پڑ رہی تھی۔ اور ماحول کچھ ایسا درد انگیز تھا کہ لبادہ پوش کا گلا بھر آیا۔ جانے کیوں، آنکھیں اس کی پُرنم ہو گئیں۔

"تم روتے ہو" اس شخص نے کہا۔ "اجنبی ہوتے ہوئے بھی تمہارا جی بھر آیا ہے۔ لیکن میں باپ ہو کر بھی نہیں روتا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے رونا نہیں آتا۔ بلکہ اس لئے کہ میری آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ اور ایک گہری لمبی سانس بھر کر وہ اسے پھر باہر گلی میں لے آیا۔ پنچمی کا چاند نکل آیا تھا اور اس کی مدھم روشنی میں وہ دونوں "پریشان روحوں" کی طرح دکھائی دینے تھے۔

لبادہ پوش کے کندھے پر پھر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے کہا" سمجھے"؛

" کیا"؛ لبادہ پوش چونکا۔

" بدامنی کی آماجگاہ کہاں ہے"؛

" بدامنی.......!

" ہاں یہی بدامنی کی آماجگاہ ہے"؛ پانی کی نامعلوم دھاروں کی طرح، جو بعد کو مل کر مہیب طوفانی ندی بن جاتی ہیں۔ یہاں بدامنی آہستہ آہستہ غیر مرئی طور پر جنم لیتی ہے۔ اور پھر مہیب آندھی کی طرح ملکوں پر چھا جایا کرتی ہے"؛

ایک لمحہ کے لئے دونوں چپ کھڑے رہے ایک لمحہ — جو لبادہ پوش کو ایک صدی معلوم ہوا۔ اور وہ شخص جانے، اس گلی، اس گلی کے گھرندے نما مکانوں اور ان مکانوں کے مکینوں کے پار کس چیز کو، جانے کس طوفان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

— یہیں دُکھ اور بدامنی پیدا ہوتے ہیں، دیکھو، پہلے مکان میں جو بوڑھا ہے، وہ تین دن سے بیمار ہے۔ لیکن اُسے دوائی میسر نہیں، اس کا لڑکا دو دِن سے بھوکا ہے۔ لیکن اسے روٹی نہیں ملتی،، اور اپنے باپ کی بیماری کے سبب وہ کام پر نہیں جا سکتا۔

دوسرے مکان میں وہ بدنصیب بڑھیا رہتی ہے جس نے اپنے تین جوان بیٹوں کو یکے بعد دیگرے دِق سے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اب وہ بھیک مانگ کر گذارا کرتی ہے۔

اور تیسرا گھر مجھ بدبخت کا ہے۔ میری حالت بھی ان سے مختلف نہیں ان سب گھروں میں ستم نصیب بستے ہیں۔ اور یہی ملک میں بدامنی پھیلانے کا باعث ہیں۔ جیسے میرا بچہ مرگیا ہے اور مجھے چین حاصل نہیں۔ اسی طرح جب اس نوجوان کا باپ مرجائیگا اور وہ فاقہ زدہ، روٹی کی تلاش میں نکلے گا تو جانے پریشانی میں وہ کیا کر گذرے۔

"لیکن تم خیراتی ہسپتالوں میں کیوں نہیں جاتے"، لبادہ پوش کو جیسے اب زبان ملی "ہاں غریبوں کو دوائی مفت تقسیم ہوتی ہے۔ شاہی لنگر خانوں میں ہر مفلس شخص کو کھانے کا سامان ملتا ہے۔ اور شاہی کارخانوں میں مزدوروں کو ملازمت ملتی ہے، راجہ کے راج میں ہر طرح کا انتظام ہے۔ تم اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ تو اس میں کس کا قصور ہے"؟

"کہاں ملتی ہے ہسپتالوں میں دوائی اور کہاں ہیں لنگر خانے"، اس شخص نے اس لہجہ میں کہا۔ جس میں درد کے ساتھ طنز بھی ملا ہوا تھا "پہلے راجہ کے جنگل کو جاتے ہی افسروں نے وہ اندھیر مچا رکھا ہے کہ غریب سسک سسک کر دن گذار رہے ہیں"۔

"مگر تمہیں نئے راجہ کے پاس جانا چاہیئے تھا"۔ لبادہ پوش نے کہا۔

"نیا راجہ — جوانی اور غرور" اور وہ شخص خاموشی سے سامنے خلا میں دیکھتا رہا، لبادہ میں کچھ حرکت ہوئی۔ لیکن لبادہ پوش چپ کھڑا رہا۔ پھر اس شخص نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "اور پھر جائیں تو اس کے پاس ہمیں پھٹکنے بھی کون دے گا، وہ آج کل وزیروں میں گھرا رہتا ہے

جو راجہ نہیں چاہتے۔ کٹھ پتلی چاہتے ہیں۔ جو اُن کے اشارے پر ناچا کرے۔"

کچھ لمحہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ ایک چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا کہیں سے اڑتا اڑتا آکر چاند پر چھا گیا۔

اچانک لبادہ پوش نے کہا۔ "میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"۔

سکھ کا متلاشی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہاری ذات کیا ہے۔ تم ان نیچ ذات کے لوگوں میں سے معلوم نہیں ہوتے"

"میں ——— میری کوئی ذات نہیں، ہم سب غریب مزدور ہیں ہم پیشہ اور ہم ذات!"

"پھر بھی"

"میں براہمن تھا"

"براہمن!" لبادہ پوش چونکا۔

"لیکن اب مزدور ہوں" اس نے ہنس کر کہا۔

"براہمن اور مزدور!"

"ہاں براہمن اور مزدور، میں براہمن تھا جب براہمنوں کے کام کرتا تھا اور اب مزدوروں کا کام کرتا ہوں تو مزدور ہوں۔ اعمال انسان کی ذات بناتے ہیں جنم نہیں" اور وہ خاموش سامنے خلا میں، جیسے ماضی کے پردوں کو چیر کر اپنی گذشتہ زندگی کی تصویر دیکھنے لگا۔

بادل کا ٹکڑا چاند پر سے گذر کر جیسے آسمان میں معلق ہو گیا۔

لبادہ پوش نے جیب سے مٹھی بھر اشرفیاں نکالیں اور انہیں براہمن کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ براہمن دیوتا بچے کا داہ کرم سنسکار کر دو!
براہمن نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ لبادہ پوش آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

راجہ نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ نیند نہیں آتی۔
خادماؤں نے پنکھے تیزی سے ہلانے شروع کر دیئے۔
"کیا وقت ہوگا؟" راجہ نے پوچھا۔
"تین پہر رات بیت چکی ہے مہاراج" ایک خادمہ نے ذرا اور جلد جلد پنکھا ہلاتے ہوئے کہا۔
"گرمی بہت ہے"
"پنکھوں کی سرسراہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔
"پنکھے بند کر دو"
"آگ برس رہی ہے مہاراج!
"پرواہ نہیں"!
خادماؤں نے پنکھے بند کر دیئے۔
راجہ لیٹ گیا۔ اسے نیند نہیں آئی۔ پنکھوں کے بغیر سونے کا اس کے لئے یہ پہلا ہی موقع تھا۔ اس کا تصور اسے غریبوں کی گلیوں میں لے گیا۔ اُس نے کروٹ بدلی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔
خادمائیں ڈر گئیں۔

جاؤ وزیر اعظم کو جگا کر کہو۔ کل دربار کا انتظام کریں۔ عام دربار کا۔ عالموں کا انتخاب ہو گا۔

خادمہ چلی گئی۔

راجہ پھر لیٹ گیا۔

خادماؤں نے پھر پنکھے ہلانے کی کوشش کی۔

راجہ نے اُنہیں روک دیا۔

اس رات اسے نیند نہیں آئی۔ اس کے دل میں خیالات کا محشر بپا رہا۔ اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دربار لگا ہوا تھا۔ راجہ بکرماجیت اپنے سونے کے سنگھاسن پر جلوہ افروز تھے۔

سب طرف خاموشی طاری تھی۔

سب راجہ کی جنبشِ لب کے منتظر تھے۔

"بدامنی کی آماجگاہ کہاں ہے"؟ راجہ نے پوچھا۔

کچھ لمحوں کے لئے سارے دربار میں خاموشی چھا گئی۔

"جہاں عاقلوں کی قدر نہیں ہوتی"

یہ کالیداس تھے۔ اُجّین کے مشہور شاعر! راجہ نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ لیکن پھر پوچھا۔ "اور"

"جہاں عورتوں پر ظلم ہوتے ہوں"

"جہاں مذہب کے نام پر انسانوں کا خون بہایا جاتا ہو"

"جہاں قحط پڑتے ہوں"

"جہاں رعایا ان پڑھ ہو"

"جہاں لوگ عیش پسند ہوں"

"جہاں راجہ ظالم ہو"

"جہاں رعایا کے کسی حصّہ کو اچھوت خیال کیا جائے"

آٹھ عالم چنے جا چکے تھے۔ لیکن راجہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔ بدامنی کا سب سے بڑا سبب کیا ہے؟

"مفلسی" بھیڑ میں سے کسی نے کہا "جہاں مفلسوں کا کوئی پرسان نہ ہو۔ اور مزدوروں کو پیٹ بھر کر روٹی نہ ملے۔ وہیں بدامنی پھلتی پھولتی ہے"۔

سب کی نگاہیں اس طرف اُٹھ گئیں۔

راجہ تخت سے اُتر پڑا۔

وہ شخص آگے بڑھ آیا۔ اس کی حالت نہایت ردّی تھی۔ کپڑے خستہ اور بوسیدہ تھے۔ سر اور پاؤں ننگے تھے۔ لیکن گڑھوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں میں اب بھی چمک باقی تھی جو دیکھنے والوں کو مرعوب کر دیتی تھی۔

راجہ نے اس کے پاؤں چھوئے اور کہا "سکھ کے متلاشی کو پرنام کرتا ہوں"۔

"امن کے طالب سکھی رہو" اور نووارد مسکرایا۔

نورتن چنے جا چکے تھے۔ مصیبت زدوں کی امداد کا کام براہمن کے سپرد ہوتا

لیڈر

لاہور
اگست ۱۹۳۳ء

تم نے گرگٹ نہیں دیکھا۔

سیاسی حلقوں میں ذرا نظر دوڑاؤ۔ تمہیں بیسیوں گرگٹ نظر آجائیں گے۔

تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے لوگ عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں۔
اکثر تو حب الوطنی کے جذبہ سے متاثر ہو کر، چاہے پھر وہ جذبہ مستقل ہو یا محض
عارضی، تحریک میں کود پڑتے ہیں۔ دوسرے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو
ایک ہی تیر سے، دو شکار کرنے کے اصول میں یقین رکھا کرتے ہیں۔ اور
خدمتِ وطن کے ساتھ خدمتِ شکم کرتے رہنا بھی گناہ خیال نہیں کرتے لیکن
تیسرے، اگرچہ ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں، اپنی طبیعت میں کچھ ایسا تلوّن
اور جدت پسندی لئے ہوئے ہوتے ہیں کہ صرف تفریح کی خاطر محض تنوع کیلئے

ایسی تحریکوں میں شامل ہو جایا کرتے ہیں۔ اناؤ کے پانڈے بچپن شرما، اِسی تیسری قسم کے محب الوطنوں میں سے تھے۔

شرما جی گھر سے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ اُناؤ میں آپ کی کافی جائداد تھی، والد مہاجنی کرتے تھے۔ کچھ مکان اور دو دکانیں بھی تھیں، کچھ زمین بھی تھی پھر بیوی تھی، بچے تھے۔ رشتے ناطے تھے۔ لیکن آپ کو رہنا زیادہ کانپور ہی میں پسند تھا۔ ایک ہی رس کی، ایک ہی طرح کے کام کی بیڑی اپنے پاؤں میں ڈال رکھنا آپ کو کبھی منظور نہ ہوا، نیا رس ہو، نیا شغل ہو، نئی زندگی ہو، یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک ہی پامال لیک پر ایک ہی ڈھیلی رفتار سے چلے جاؤ۔ اِسی لئے اگر آپ آج ایک کام کو ہاتھ میں لیتے تو کل اس سے اکتا کر دوسرا لے بیٹھتے۔ اور پرسوں دونوں کو کوستے ہوئے تیسرے کے مشتاق بنے نظر آتے۔ زندگی کے سمندر میں کبھی آپ نے غوطہ خور بن کر نہ دیکھا۔ ملاح کی طرح اوپر ہی اوپر رہے۔ اِن دنوں جب کانپور میں تحریک آزادی شروع ہوئی۔ تو آپکے سر میں آثار قدیمہ کی تحقیق کا خبط سوار تھا۔ اور آپ کا ذہن ہڑپہ اور موہنجو دڑو کے کھنڈرات کی سیر کرتے کرتے اکتا گیا تھا۔ چنانچہ تحریک کے شروع ہوتے ہی شرما جی بھی اُس میں کود پڑے۔ جیل جانے کو چونکہ آپ ذرا تکلف سمجھتے تھے۔ اس لئے سُودیشی پرچار کمیٹی" کے پراپیگنڈہ سیکرٹری بن گئے۔ اور شہر اور دیہات میں زوروں سے کھادی کا پرچار کرنے لگے۔

اُنہی دِنوں میں گاندھی ہفتہ بھی آگیا۔ پنڈت جی کو اپنی کارگذاری دکھانے

کا موقع مل گیا۔ انہوں نے اس دن کے لئے ایک بڑے بھاری جلوس کا اعلان کر رکھا تھا۔ دور دور کے جولاہوں کو اُس میں شامل ہونے کی دعوت دے رکھی تھی۔ اتنے دنوں سے گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ پھر کر جو پرچار وہ کرتے رہے تھے۔ اس کی کامیابی کا اُنہیں پورا یقین تھا۔ چنانچہ جب جلوس نکلا تو نصف میل لمبی جولاہوں کی ٹولیاں تھیں۔ سب سے آگے شرما جی تھے۔ دیسی سوت کے تاروں کے ہار پہنے اور ہاتھ میں جھنڈا اٹھائے۔

جنرل گنج پہنچتے پہنچتے شرما جی کے جوش کی انتہا نہ رہی۔ کانپور میں کپڑے کا یہی بڑا بازار ہے۔ یہیں انہیں لیکچر دینا تھا۔ ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی رگیں ابھر آئیں۔ اُنہوں نے پورے زور سے نعرہ لگایا — "کھادی پہننا" اور ہزاروں آوازیں ایک ساتھ گونج اٹھیں — "غریب ہندوستان کو فاقے سے بچانا ہے" اور تب ایک والنٹیر کہیں سے کرسی اور میز اُٹھا لایا۔ پنڈت جی اس پر کھڑے ہو گئے۔ جلوس یہاں تک آتے آتے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ جولاہوں کے علاوہ سکول اور کالج کے طلبا، دوکان دار اور دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ جھنڈے کو ایک ہاتھ میں تھام کر اپنے حلق کی پوری آواز سے پنڈت جی نے کہنا شروع کیا — "دوستو، آج ہم ایک نازک دور سے گذر رہے ہیں، اس وقت ہمیں سرکار انگلشیہ ہی سے نہیں لڑنا، بلکہ اپنے ان بھائیوں کا بھی مقابلہ کرنا ہے جو خود غرضی سے اندھے ہو کر ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط بنا رہے ہیں، جو دولت پیدا کرنے کی دھن میں ہر طرح کے دھوکے کو، ہر طرح کے فریب کو جائز سمجھتے ہیں۔ آج

ہم گاندھی ہفتہ منا رہے ہیں۔ ہندوستان کی —— ہندوستان ہی نہیں، دنیا کی اس برگزیدہ ہستی کا فرمان ہے کہ آج زیادہ سے زیادہ مقدار میں کھدر فروخت کیا جائے۔ لیکن وہ ہمارے بھائی مل کے کپڑے کو ہی کھادی کہکر فروخت کر رہے ہیں۔"

اور یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے جنرل گنج کی بڑی بڑی دو کانوں کی طرف دیکھا۔ اور مجمع میں سے ہزاروں آوازیں 'شیم شیم' کہکر چلا اٹھیں۔

اس کے بعد پنڈت جی آہستہ آہستہ اپنی آواز کو اونچا کرتے گئے۔ وطن کی اندوہناک حالت کا نقشہ انہوں نے دردانگیز الفاظ میں کھینچا، دوسرے ممالک کے لوگوں کی حب الوطنی کی داستان بیان کی۔ کھادی سے غریبوں کو کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ اور مل کے کپڑے سے امیروں کی کس طرح جیبیں بھرتی ہیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اچانک ڈرامائی انداز میں جولاہوں کیطرف مخاطب ہوئے اور اُنہوں نے کہا۔

"سرمایہ داروں کی خودغرضیوں کا شکار بننے والے غریبو، جاگو، کہ تمہارے ہاتھ سے روٹی چھینی جا رہی ہے، جاگو کہ تمہارے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑا جا رہا ہے۔ تم خاموش بیٹھے ہو، ہاتھ نہیں ہلاتے، روتے نہیں، چلاتے بھی نہیں، ادھر مہاتما گاندھی نے کھدر پہننے کی تلقین کی ہے اور ادھر مل مالکوں نے دھڑا دھڑ کھدر تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بھوکے ہاتھ سے روٹی کا خشک نوالہ تک چھین لینے کو تیار ہیں۔ وہ کھادی کی تحریک کو چلنے نہیں دینا چاہتے۔ لیکن اگر تمہاری رگوں میں جان ہے، اگر تمہاری

تنظیم میں طاقت ہے تمہاری آہوں میں اثر ہے، اور تمہارے نالوں میں درد ہے۔ تو بازی تمہارے ہاتھ رہے گی۔"

حاضرین نے تالیاں پیٹیں۔ شرما جی پھر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان سے کھدر خریدنے کی درخواست کی اور کہا "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے ہم محلے محلے جائیں گے۔ گلی گلی جائیں گے۔ ان غریب بے بسوں کی کہانی سب کو سنائیں گے۔ اور مجھے یقین ہے۔ دردمند محب الوطن ہماری پکار سنیں گے۔"

اس کے بعد جھنڈیوں کی سرسراہٹ کی آواز فلک شگاف قومی نعروں کے شور میں گم ہو گئی۔ پنڈت جی نے کھادی کی گاڑی آگے لانے کو کہا۔ اور دیکھتے دیکھتے کئی سو کا کھدر بیچ دیا۔

کئی دنوں تک خوب مقابلہ ہوا۔ پنڈت جی نے سرمایہ داروں اور بڑے بڑے بیوپاریوں کو زک دینے کے لئے۔ نئے نئے طریقے ایجاد کئے پکٹنگ کرنا تو کانگرس کے پروگرام کا ایک حصہ ہی تھا۔ لیکن پنڈت جی نے ایک والنٹیر کور ایسی بنائی جو جاسوسی کا کام کرتی تھی۔ ایک گز بھی مل کا کپڑا آپ نے فروخت نہ ہونے دیا۔

کارخانے دن رات چلتے لیکن مال کی کھپت اتنی نہ ہوتی۔ مل مالکوں نے مزدوری کم کرنے کا فیصلہ کیا، انہیں عام ہڑتال کی دھمکی دی گئی ادھر بڑے بڑے دوکانداروں کی دکانوں پر اُلو بولنے لگا۔ جنرل گنج گاہکوں

کی بجلائے۔ دوکانداروں اور کانگریسی والنٹیروں کی آنکھ مچولی دیکھنے والوں کے لئے تماشا گاہ بن گیا۔ آخر کارخانہ داروں اور بیوپاریوں کا ایک وفد کانگرس کے بڑے بڑے رہنماؤں سے ملا۔ اور ان کے سامنے انہوں نے اپنی مصیبت کا رونا رویا۔ انہوں نے کہا۔ ہمارے لئے پہلے ہی بدیشی مال کا مقابلہ کرنا دشوار ہو رہا ہے۔ اگر ملک میں بھی ہماری مخالفت کی جائیگی۔ تو اس صنعت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ کارخانے بند کر دینے پڑینگے۔ اور کھادی سے جتنے جولاہوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ ان سے کہیں زیادہ تعداد میں مزدور بیکار ہو جائیں گے۔"

اسی سلسلہ میں وفد صدر انڈین نیشنل کانگرس کے پاس بھی گیا۔ انہوں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کانگرس کھادی کا پرچار ضرور کرتی ہے لیکن مل کے کپڑے کا بائیکاٹ نہیں کرتی۔" مگر جب انہیں پانڈے بھیچن شرما کی تحریک کا حال سنایا گیا۔ تو راشٹرپتی نے خود معاملہ سلجھا دینے کا یقین دلایا۔

شرما جی معاملہ نہ سلجھانا چاہتے ہوں، یہ بات نہ تھی۔ وہ خود اس لیڈری کی بک بک سے تنگ آ گئے تھے۔ لیکن لیڈری ہی شہد کی طرح انہیں کچھ ایسی چمٹی تھی۔ کہ چھوڑنے میں نہ آتی تھی۔ دن رات کام کرتے کرتے وہ تھک گئے تھے، ان کی صحت بھی ٹھیک نہ رہی تھی۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی۔ کہ وہ اس یکرنگی سے گھبرا اٹھے تھے۔ وہ تحریک

سے چھٹکارا تو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خوش اسلوبی کے ساتھ۔ ایسے کہ لیڈری بھی قائم رہے اور ان سب جھگڑوں سے نجات بھی مل جائے۔ اس لئے جب مقامی لیڈروں نے ان سے اس طرح کی پکٹنگ بند کر دینے کو کہا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ آخر ان جولاہوں کا کیا بنے گا۔ جو تحریک کے زوروں میں چلنے سے پھر اپنا کاروبار شروع کر بیٹھے ہیں۔ اب تحریک بند کر دی جائے تو وہ ایک دم پھر سب کے سب بیکار ہو جائیں گے۔"

مقامی لیڈر اب اتنے جولاہوں کا کیا انتظام کر سکتے تھے ہشرما جی کا مطالبہ تھا۔ کہ ان سب کو مل مالک نوکریاں دیں۔ آخر پھر راشٹر پتی کو تار دیئے گئے۔ وہ آئے۔ کانفرنسیں ہوئیں اور معاملہ سلجھ گیا۔ کہنے کی ضرورت نہیں شرما جی ان تمام کانفرنسوں میں بڑے رعب کے ساتھ شامل ہوتے۔ طے یہ ہوا کہ کارخانہ دار پنڈت جی کے پیرو جولاہوں میں سے نصف کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیں۔ اور باقیوں کے لئے کچھ سرمائے سے ایک اور کارخانہ کھولا جائے اور شرما جی ہندوستانی کپڑے کی مخالفت نہ کریں۔ شرما جی اس کے لئے پہلے ہی تیار تھے۔ انہوں نے کہا آج سے میں تنگ دائرے کو چھوڑ کر اس تحریک کو وسعت دیدونگا۔ اور صرف کھادی کی بجائے تمام دیسی چیزیں خریدنے کی تلقین کرونگا۔

اور اسی شام کو ایک بڑے بھاری جلسے میں انہوں نے "سودیشی سنگھ" کی بنیاد رکھ دی۔

دوسرے دن پنڈت جی کو تار ملا۔ تارا کی شادی ہے جلدی پہنچو۔ تارا آپ کی بھتیجی کا نام تھا۔ پنڈت جی بھی اب فارغ تھے۔ اسی صبح اُناؤ کو روانہ ہو گئے قصبے میں ان کے آنے کی اطلاع پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ ان کے عقیدت مندوں نے اُناؤ کی کانگرس کمیٹی کو پیشتر ازیں مطلع کر دیا تھا۔ جونہی گاڑی سٹیشن پر رُکی، سودیشی کی جے' پانڈے بچن شرما کی جے' کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ پنڈت جی کچھ حیران سے رہ گئے۔ اپنے ہی قصبہ میں اُنہیں اس استقبال کی اُمید نہ تھی۔ لیکن شہرت کا سورج جب چمکتا ہے، تو اس کی شعاعیں کہاں کہاں نہیں پہنچ جاتیں۔ شرما جی اترے تو کانگرسی رہنماؤں نے ان کے گلے میں ہار ڈالے۔ پھر دیویاں آگے بڑھیں۔ شرما جی کا سینہ کئی انچ بڑھ گیا۔ لیکن جونہی اپنے رشتہ داروں پر ان کی نظر پڑی، گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سب مسرت ہوا ہو گئی۔ اس تمام ہجوم میں صرف ان کے گھر والے ہی بدیشی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ جب ان کی بیوی نے ان کے گلے میں ہار ڈالے۔ تو اُنہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی انہیں بھگو بھگو کر جوتے مار رہا ہو۔

وہ دن شرما جی نے گھر سے باہر ہی گذارا۔ سنگھ کی شاخ اُناؤ میں کھلی۔ اپنے اعزاز میں دی جانے والی ایک پارٹی میں شامل ہوئے۔ مزدوروں کے ایک جلسہ میں تقریر کی۔ کافی رات ہو چکی تھی، جب آپ نے گھر کی طرف قدم اٹھایا۔ خیال تھا، اپنے کمرے میں چپ چاپ جا کر سو رہیں گے۔ سب سے زیادہ

انہیں اپنی شریک حیات پر غصہ تھا۔ آخر اس طرح اُن کی رسوائی کیوں کی گئی؟ اگر کھادی کے کپڑے نہ پہنے جاتے تھے تو سٹیشن پر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ شریمتی جی نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ اور رو رو کر آنکھیں سوجا لی ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ شرما جی کچھ فیصلہ نہ کر سکے! وہ تو سوچتے آرہے تھے، کہ بیوی سے بنا آنکھ ملائے، چپ چاپ جا کر لیٹ جائیں گے۔ بلائیگی تو بات تک نہ کریں گے۔ اور آج جس طرح ان کی بے عزتی کی گئی، اس کا پورا پورا بدلہ لیں گے۔ لیکن اُلٹا انہیں منت خوشامد کرنی پڑی۔ ضیافت میں شترولی کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے اور اس کے نتیجہ کے طور پر پیٹ میں تل بھر بھی جگہ نہ ہونے کے باوجود آپ کو کچھ نہ کچھ لقمے زہر مار کرنے ہی پڑے۔ تب کہیں جا کر دیوی جی مانیں۔

بس یہیں شرما جی کی ہار تھی۔ گھر میں ہمیشہ انہیں دبنا پڑتا تھا۔ انکی لسانی؛ ان کا جوش و خروش، ان کی ہوشیاری، ان کی لیاقت سب یہاں ٹھنڈے پڑ جاتے تھے۔

دوسرے دن بیوی نے ساتھ چل کر کچھ کپڑا خرید دینے کو کہا۔ شرما جی کو اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا بولے۔ "مجھے ساتھ لے جا کر کیا کرو گی؟ پہلے ہی کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ اب کچھ دن یہاں رہنے بھی دو گی یا نہیں؟"

بیوی نے ان کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ اس سب تقریر کا مقصد کیا ہے؟

"کل وہاں بدیشی کپڑے پہن کر کیوں چلی گئی تھیں" شرما جی نے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے!" بیوی نے ایک قہقہہ لگایا۔ "آپ کے سر کچھ دن کے لئے یہ خبط سوار ہوا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سب ہی خبطی ہو جائیں"

"میں خبطی ہوں!" شرما جی نے گرج کر کہا۔

بیوی نے ذرا متین ہو کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ میں کچھ خرید کر نہ دونگا۔ پہلے ہی آپ کونسی کوئی چیز لا کر دیتے ہیں۔ شادی کا معاملہ تھا۔ اتنے لوگ آئیں گے۔ اس لئے کہدیا ورنہ میں آپ کو کب کسی چیز کیلئے کہتی ہوں۔ اتنے میلے، اتنے تہوار آتے گئے۔ میں نے کبھی آپ کو نگوڑی ساڑھی تک کیلئے تو کہا نہیں۔ تارا آپ کی بھتیجی ہے۔ اسے تو اچھے ہی کپڑے دینے ہونگے۔ آپ اپنی سبکی کرا سکتے ہیں۔ لیکن میں تو نہیں کرا سکتی۔"

اور وہ منہ ڈھانپ کر سسکنے لگی۔

شرما جی کی پیشانی کے تیور ڈھیلے پڑ گئے۔ اب کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ آخر اُنہوں نے کہا۔ "تو تم جا کر لے آؤ، میں کب روکتا ہوں؟"

"مجھے کیا غرض پڑی ہے" اور یہ کہہ کر وہ واپس مڑنے لگی۔

شرما جی جانتے تھے، ساتھ گئے بغیر چھٹکارا نہ ہوگا۔ اب نہ جائیں گے۔ تو شام کو جانا پڑے گا۔ اور جھگڑا اور رونا رُلانا الگ ہوگا۔ آخر لمبی سانس لے کر اٹھے۔ اور بولے "چلو"

راستے میں شرما جی نے کہا۔ "دیکھو جہاں تک ہوسکے سودیشی کپڑا ہی خریدنا۔ تم نہیں جانتیں اپنے دیس کا کپڑا پہننے سے ملک کو کتنا فائدہ ہوتا ہے اور ولائتی

کپڑا خریدنے سے ہندوستان کو جو نقصان ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے وہ اپنی شریکِ حیات کو سمجھانے لگے۔ وہ بھی خاموشی سے سنتی رہی۔ اور شرما جی کو امید بندھ گئی کہ ان کی تقریر کارگر ہو رہی ہے۔

بزازوں کی دوکانیں تو اناؤ میں اور بھی تھیں لیکن شرما جی کے یہاں ہرلال کی دوکان سے ہی سب سامان آتا تھا۔ وہاں پہنچے تو ہرلال کو ہی کھادی پہنے دیکھ کر آپ ذرا جھجکے۔ شرما جی نے سوچا تھا۔ اس کا کوئی شاگرد یا نوکر دوکان پر ہوگا۔ کپڑا خریدیں گے اور چلیں آئینگے۔ لیکن اب' اب کیا کریں'؟ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا؟ خاموشی سے آگے بڑھے۔

شرما جی کو دیکھ کر ہرلال نے سودیشی کپڑوں کا انبار لگا دیا۔ شرما جی بھی حوصلہ سے سودیشی کے گُن گاتے ہوئے شریکِ حیات کو کپڑے دکھلانے لگے لیکن دیوی جی کو کچھ پسند نہ آیا۔ آخر اُنہوں نے دُکاندار سے کہا۔" تمہارے یہاں ویسی ساڑھیاں نہیں جیسی پہلے تارا کے لئے گئی ہیں؟"

دکاندار تاڑ گیا۔ کنکھیوں سے شرما جی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا" وہ تو بدیشی تھیں، ہم نے بدیشی مال بیچنا بند کر دیا ہے۔ کچھ تھوڑا سا اندر بند پڑا ہے۔ کہئے تو دکھا دوں؟"

" دکھائیے!" دیوی جی نے کہا۔

شرما جی نے ایک جلتی ہوئی نگاہ شریمتی جی پر ڈالی۔ اور تھوکنے کے بہانے نیچے بازار میں جا کھڑے ہوئے۔

وہ ابھی کھانس ہی رہے تھے کہ ان کے کان میں قصبہ کے چمار بہاری کی آواز آئی۔ خاوند اور بیوی ایک منیاری کی دکان پر کھڑے جھگڑ رہے تھے۔ بیوی کہہ رہی تھی۔ "ہم گریب مجبور ٹھہرے ہم اتنے پیسے نہیں کھرچ سکتے"

پنڈت جی نے دیکھا۔ وہ سستی جاپانی بنیان اٹھا رہی تھی۔

"نہیں میں یہ بدیسی مال نہ کھریدنے دونگا" بہاری نے بنیان چھینتے ہوئے کہا "کسی انگریج کو دیکھو۔ سستی ہندوستانی چیزیں کھریدنے کے بدلے مہنگی ولایتی چیزیں کھریدے گا۔"

دیسی بنیان ان دنوں پانچ آنے کو آتی تھی۔ بہاری نے پانچ آنے دوکاندار کے سامنے پھینک دیئے۔ اور بنیان اٹھالی۔

بیوی نے کہا "میں اس بنیان کو انگ نہ لگاؤنگی۔ پانچ آنے میں تو دھلوا کے دو کرتے سل جاتے ہیں۔"

"تم نے اپنے قصبہ کے لیڈر پانڈے بچن شرما کی باتیں نہیں سنیں۔ کہتے تھے "سارے ملک اپنے اپنے دیس کی چیزیں کھریدتے ہیں۔ پھر ہم کیوں بدیسی مال کھریدیں۔"

شرما جی ذرا ایک طرف ہٹ گئے۔ اس چمار کے سامنے ہوتے ہوئے اُنہیں شرم آئی۔

بہاری اپنی بیوی کو سمجھاتا ہوا چلا گیا۔ سب وہی دلیلیں تھیں جو انہوں نے کل جلسے میں دی تھیں۔ ایک لمبی سانس چھوڑ کر اُنہوں نے دوکان کی طرف دیکھا۔

دوکاندار نے کہا: "یہ سب دو سو کا ہوا" اور بل بنانے لگا۔
ان کا جی چاہا سب اُٹھا کر رکھ دیں، اور سو دیشی کپڑا خریدیں لیکن دوسرے لمحہ نوٹوں کا بنڈل وہیں سے انہوں نے بیوی کی طرف پھینک دیا۔

اس دن سے شرما جی نے سیاسی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینا ترک کر دیا۔ اور اپنے کمرے میں بند ہو کر "عورت کی نفسیات" پر ایک مستند کتاب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

احساسِ فرض

جالندھر
دسمبر ۱۹۲۹ء

نوجوان نے محبت کی خاطر، ماں باپ، رشتے ناطے سب چھوڑ دیئے
لیکن جب فرض کی بات آئی تو اس نے محبت کو بھی
خیرباد کہہ دیا۔

کمرے میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر نقاب پوش سردار کی جنبشِ لب کا منتظر تھا۔

قندیل کسی مفلس و قلاش مزدور کے دل کی طرح آہستہ آہستہ جل رہی تھی۔ اور اس کی مدھم شعاعیں کمرے میں کچھ دور تک جا کر معدوم ہو جاتی تھیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"ٹھپ!" — چھوٹی سی چوکی پر سردار کے ہاتھ کی ایک دھیمی سی آواز سنائی دی۔ اور ہر شخص ہمہ تن گوش ہو کر سردار کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔

"ممبر ۳، ؟"

"جناب !"

آواز بھاری تھی۔ جیسے اسے کسی چیز سے بدل دیا گیا ہو۔

"سب ممبر آگئے ؟"

"جی !"

پھر ہیبت ناک خاموشی چھا گئی۔

"سب تیار ہیں؟"

"سب !" — دھیمی مگر بھاری آواز، جیسے کوئیں میں کسی نے "سب" کہا ہو۔ یا گنبد میں یہ لفظ گونج اٹھا ہو !

"شاید سب کو معلوم ہو گا کہ ہم یہاں کس مطلب کیلئے اکٹھے ہوئے ہیں" سردار نے نہایت متین اور سنجیدہ آواز میں کہنا شروع کیا، جس میں جوش یا جذبات کا شائبہ تک نہ تھا، "دوستو ظلم کا سہنا بھی اتنا ہی گناہ ہے — جتنا ظلم کا روا رکھنا، ہمیں ظلم سہتے سہتے صدیاں گزر گئی ہیں۔ اور اب وقت آگیا ہے۔ کہ انسان کو انسان سے انسانوں جیسا سلوک کرنا سکھایا جائے۔ اور یہ بات آسانی سے نہ ہو سکے گی۔ اس کے لئے قربانی کرنا ہو گی۔ روئے بغیر ماں بھی بچے کو دودھ نہیں دیتی۔ پھر ہم جو اتنے حقوق لاکھوں فردوں کے لئے مانگ رہے ہیں۔ وہ کس طرح آسانی سے مل جائیں گے۔ ہمیں ان کے حصول کی خاطر جانے کتنی دیر لڑنا ہو گا، جانے کتنی قربانیاں دینی پڑینگی؟"

سردار کچھ لمحہ کے لئے خاموش، جیسے نقاب کے پیچھے چھپی ہوئی تیز

آنکھوں سے سب ممبروں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا ___ ان چہروں کا، جو نقاب پوش ہونے پر بھی شاید سردار کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے کہنا شروع کیا۔

"وہ نوجوان جس کے پاؤں میں اس کے رشتہ داروں کا پیار بیڑیاں بن رہا ہو۔ یا جو اپنے عزیز بھائیوں کے لیے، اپنی قربانی پیش نہ کر سکتا ہو، وہ غور کر لے، ابھی وقت ہے، اچھی طرح غور کر لے اور ہمارے راستہ سے پیچھے ہٹ جائے۔ صرف اُسے ہی میدان میں کودنا ہوگا جسے جان کے مقابلہ میں عزت پیاری ہے۔"

سب خاموش، پتھر کی مورتیوں کی طرح ساکت، اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔

"تو سب تیار ہیں"۔ سردار نے پوچھا۔

سب خاموش رہے لیکن گردنوں کی جنبش نے انکے ارادے بتا دیئے

"سب کو اس کلب کی شرائط منظور ہیں!"

سب کے سر اثبات میں جھک گئے۔

"نمبر ۲"!

ایک پتلا سا چست نقاب پوش اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

"انہیں بتا دو کہ اس شخص کا کیا حشر ہوگا، جو اس انجمن کے احکام کی خلاف ورزی کریگا۔ یا کسی کے پاس، خواہ وہ کتنا بھی عزیز کیوں نہ ہو، اس کا کوئی راز فاش کریگا۔"

پروقار چال سے چلتا ہوا "۲۷" سردار کی چوکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اور نہایت ذمہ دار متین آواز میں اس نے کہنا شروع کیا۔

"کلب کا وہ ممبر جو کلب کا رکن ہوتا ہوا اس کے کسی حکم سے کبھی کترانے کی کوشش کریگا۔ بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا جائیگا"!

سب خاموشی جسم میں سنسنی سی پیدا کر دینے والی خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ صرف "۲۴" خفیف سا کانپا۔

"۲۴" سردار کی آواز گرج اٹھی۔

"جناب"!

"کیا بات ہے"؟

"کچھ نہیں"!

"ڈرتے ہو"؟

"بالکل نہیں"!

"سوچ لو"

"سوچ چکا ہوں"

پھر پانی میں یکے بعد دیگرے پرچیاں ڈالی گئیں۔ اور قرعہ اندازی سے تین پرچیاں نکلیں ـــ "۳۷ .... ۲۴ ...... ۲۷"

تینوں نقاب پوش مستعدی سے اٹھے۔

سردار نے کہا ـــ "دوستو مفلس اور غریب مزدوروں کو تمہاری ضرورت ہے۔ آج ہزاروں مزدوروں کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ پورے

دو مہینے سے ہڑتال جاری ہے۔ ہزاروں مزدور بیکار ہیں اور ان کے بیوی بچے فاقوں سے دن کاٹ رہے ہیں۔ بیمار ہو رہے ہیں۔ مر رہے ہیں ہماری انجمن نے انہیں یقین دلایا ہے۔ کہ ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔ سرمایہ داروں کی انجمن کے صدر ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں وہ پہلے جھکانا چاہتے ہیں، پھر توڑنا۔ لیکن ہم ٹوٹ بھلے ہی جائیں جھکینگے نہیں، تمہارے دلوں میں جوش ہے، رگوں میں خودداری اور حمیت کا خون ہے۔ اور خون میں حرارت اور قربانی کا مادہ موجود ہے۔ تم خود مزدور ہو۔ مل میں صبح چھ بجے سے رات کے ۹ بجے تک جسمانی کام کرنے والے اور کارخانے یا دفتر کے کسی اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر صبح سے لے کر شام تک رجسٹروں سے آنکھیں پھوڑنے والے مزدور میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے جاؤ، اور غاصبوں سے غریبوں کے خون کا بدلہ لو۔"

تینوں نے سر جھکا لئے۔

"پہلا وار انجمن کے صدر پہ ہو گا۔"

"................"

"یہ ریوالور لے لو" سردار نے چوکی کی جیب سے دو ریوالور نکال کر ۲۷ اور ۲۴ کو دیتے ہوئے کہا۔ "۲۷، دیکھو جس وقت سیٹھ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر علی الصبح سیر کو جا رہا ہو، ایک فائر سے اسے موت کی آغوش میں سلادو۔ اور ۲۴ تم اس کے ساتھ رہو، اور ۲۷......"

"جناب!"

"تم یہاں ٹھہرو، آج کی مجلس برخاست، آئندہ بیٹھک کی خبر اور جگہ کا پتہ وقت پر دے دیا جائیگا"

سب آہستہ آہستہ چلے گئے۔

تب سردار نے ۷ سے کہا۔ "تم ان دونوں کے پیچھے رہنا! اور جو وقت پر مناسب ہو کرنا۔ علی الصبح چار بجے کمپنی باغ کے دروازے پر پہنچ جانا۔

نوجوان نے سر اٹھایا، لیکن سردار جلا گیا تھا۔

"برسات کا موسم بھی کیا دلچسپ اور عجیب موسم ہے"۔

"..........."

"اور پھر کتنا راحت افزا اور زندگی بخش، گرمی سردی کو تو میں موت کے پیامبر سمجھتا ہوں، زندگی کا پیغام تو برسات اور بہار میں ہے۔ قدرت کی دیوی کے سراپا میں جانے ان دنوں کیسی مقناطیسی کشش آجاتی ہے۔ بھیگی بھیگی راتیں، خوشبوؤں سے لدی ہوئی بھاری بھاری فضائیں۔ اور پھر ہزاروں مسرتوں کو پہلو میں لیئے دھڑکتا ہوا آسمان!"

"صرف ایک گہری لمبی سانس"

"کنتی!"، آواز میں تشویش!

کنتی مسکرائی، پرسوز مسکراہٹ! "میں سوچ رہی ہوں دیپو" اس نے کہا۔ "تمہاری طرح کے شاعر مزاج دنیا میں کتنے ہیں؟ اور اس دیوی کی مقناطیسی کشش کا اثر کتنوں پر ہوتا ہے"

دیویندر کا پرتشویش چہرہ کھل گیا۔ اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "واہ!" وہ بولا "اِس میں شاعری کی کونسی بات ہے؟ ذرا ادھر ان مغرب کی طرف سے اٹھتے ہوئے بادلوں کو دیکھو، کس طرح مست ہاتھیوں کی طرح بڑھے چلے آرہے ہیں۔ لمحوں میں سارے آسمان پہ چھا جائیں گے اور پھر تہوں پر تہیں چڑھ جائیں گی۔ کبھی کبھی بجلی چمک اٹھے گی، اور پھر چھم چھم بارش ہوگی۔ جھڑی لگ جائیگی۔ اور میں نہاؤں گا۔ سچ کہتا ہوں اوپر چھت پر نہاؤنگا چھت پر جب تک کہ ٹھٹھرنے نہ لگ جاؤں!"

اپنے اس چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں بچے کی سی شوخی اور اشتیاق دیکھ کر کنتی دل ہی دل میں ہنسی — آہ! اپنے چھوٹے سے سنسار میں مست نوجوان تو کیا جانے کہ دنیا کتنی تنگ نظر اور تنگ دست ہے! اور پھر بظاہر آہستہ سے بولی — "دیبو! بتا سکتے ہو، اِن بادلوں کو دیکھنے کی، ان کی یورش کا لطف اٹھانے کی فرصت تمہاری طرح کتنوں کو ہے؟"

دیویندر پھر ہنسا۔ "فرصت" اس نے بے پرواہی سے کہا۔ "اِن نظاروں کا لطف اٹھانے میں فرصت کی کیا ضرورت ہے آنکھیں چاہئیں!"

"بہت لوگوں کی آنکھیں ہیں لیکن ان کی آنکھوں کو بھی وقت نہیں ملتا۔"

"اِس کے لئے دِل کی ضرورت ہے"

اپنے اس بھائی کی بے سمجھی پہ کنتی ہنسی "ان میں سے اکثر کا دل مر چکا ہے۔"

دیبو خاموش ہو گیا۔

تب آہستہ آہستہ کنتی نے کہا — "دیبو تم نے کبھی غور کیا۔ ان بڑے بڑے کارخانوں، ان محلوں جیسی عظیم الشان عمارتوں کے اندر کتنے ناخواندہ اور خواندہ مزدور صبح سات سات بجے سے لیکر رات کے نو نو بجے تک کام کرتے ہیں۔ برسات اپنی مستی اور کیفیت کو لئے ہوئے آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ بہار اپنے زنگار رنگ کے پھولوں، اپنی خوشبوؤں، اپنے نغموں کو لئے آتی ہے اور چلی جاتی۔ ان بیچاروں کے لئے سردی گرمی، برسات بہار میں کچھ بھی فرق نہیں۔"

دیویندر کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کا جوش جیسے ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔ پھر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ...... "تم بھی بہن" اس نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ "جانے سارا سارا دن کیا سوچا کرتی ہو، اگر کچھ بدبختوں کو قدرت کے مناظر کا لطف اٹھانے کے لئے فرصت نہیں ملتی، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں، کہ جن کو ملتی ہے، وہ اسے خود بخود اپنے لئے حرام کر لیں۔ دنیا میں کبھی سب ایک جیسے ہو سکیں گے۔ اس بات کی مجھے امید نہیں۔" اور اس نے ایک بہت لمبا قہقہہ لگایا۔

"کم از کم آج کا دن میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔" اور جیسے پیاسی آنکھوں سے اس نے امڈتی ہوئی گھٹا کو دیکھا۔

لیکن کنتی کی آنکھوں میں بھی بادل امڈ آئے تھے۔ اور شاید اپنے اس چھوٹے بھائی کی ناسمجھی، اس کی سنگ دلی، دیکھ کر برس ہی پڑنا چاہتے تھے۔ کہ ان کے والد گھر میں داخل ہوئے۔

والد کی آنکھیں ہمیشہ کچھ ایسی بھوکی بھوکی، عقاب کی آنکھوں کی طرح کچھ ایسی تیز تیز ہوتیں، کہ دونوں اپنے خیالات کو ان کے سامنے چھپا لیتے تھے۔ نہ دیویندر شاعر رہتا اور نہ کنتی فلسفی رہتی۔ والد کی آنکھیں جیسے کچھ ڈھونڈتی رہتیں۔ جیسے ان کے دلوں میں ڈوب کر وہاں سے کچھ نکال لینا چاہتیں۔ اور اس لئے وہ دونوں ہی بہت کم ان کے سامنے ہوتے۔

کنتی نے جیسے اپنے اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پی کر مسکرانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "پتا جی آج مجھے لیلا کے گھر جانا ہے، تین برس بعد وہ آج افریقہ سے آئی ہے۔ اور شاید میں رات کو بھی وہیں رہوں۔"

تبھی جیسے دیویندر کو یاد آیا کہ اس کا دوست جگموہن آج جا رہا ہے، صبح چار کی گاڑی سے اور اسے اس کو الوداع کہنے جانا ہے۔ اور رات کو اس کے یہاں پارٹی بھی ہے۔

والد اور دنوں کی نسبت اپنے خیال میں کچھ زیادہ محو تھے۔ اور ان کی آنکھیں اور دنوں کی نسبت کچھ زیادہ بھوکی تھیں۔ لیکن دیویندر بادلوں کی یورش کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اور کنتی قرطاس پر ایک غریب بھکاری کی تصویر بنا رہی تھی۔

"میں آج جا رہا ہوں، باہر، تم میں سے ایک کا گھر پر رہنا ضروری ہے۔" انہوں نے کہا اور پھر کچھ لمحہ بعد بولے، "جاؤ تو باہر تالا لگاتے جانا"

اور یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اندر کمرے میں چلے گئے۔

بارش ہونے لگی تھی۔ دیویندر اوپر چھت پر بھاگ گیا۔ اور کنتی تصویر کشی

کا سامان اٹھا کر اندر لے گئی اور چپ چاپ کھڑکی میں کھڑی ہو کر دور تک چھائی ہوئی گھٹاؤں کو دیکھنے لگی۔

تبھی اوپر سے دیویندر کے گانے کی آواز آئی ـــ

گھٹائیں گھر آئیں گھنگور

گھٹائیں

کنتی نے سنا۔ اس کا بھائی گا رہا تھا۔ اس آواز میں جس میں مسرت، پیاس اور جنون تینوں ملے ہوئے تھے۔ گا رہا تھا۔

مست پپیہا!

بے سدھ کوئل!

پاگل ہیں رے مور

گھٹائیں

گھر آئیں گھنگور!

اور نفرت سے دل ہی دل میں کنتی نے کہا ـــ "Idiot" (بیوقوف)

ایک شخص سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی کوٹھی میں داخل ہوا۔

رات کسی مزدور کے مستقبل کی طرح تاریک تھی۔

دروازہ بند تھا اور صاحب آرام کرسی پہ پڑے پڑے اونگھ رہے تھے کھانا وہ بے حد زیادہ کھا گئے تھے۔ پورے کا پورا مرغ ان کے پیٹ میں آرام

کر رہا تھا۔ اور ان کے خیالات منتشر تھے۔

نو وارد نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ اور دروازہ احتیاطاً بند کرتا گیا۔ لیکن کنڈی اس نے نہیں لگائی سپرنٹنڈنٹ آہٹ پا کر جاگ کھڑے ہوئے۔ اور اجنبی کو پہچان کر بولے ––

"کہو کیسے آنا ہوا؟"

"نہایت ضروری کام ہے"

"کیا؟"

سیٹھ بہاری لال کی جان خطرے میں ہے۔ انقلاب پسندوں کے ایک گروہ نے دو آدمی ان کا خاتمہ کرنے کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔"

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔

باہر کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ نو وارد کا دل بیٹھ گیا اُس نے جھپٹ کر باہر کی طرف دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ دور پھاٹک پر سپاہی بدستور پہرہ دے رہا تھا۔

تب دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی لگا دی۔

سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔ "کون تھا؟"

اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو قابو میں کر کے نو وارد نے کہا۔ "کوئی نہیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا۔ جیسے کوئی دروازے کے ساتھ لگا ہماری باتیں سُن رہا ہو۔"

سپرنٹنڈنٹ کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا ––"یہاں تک آنے کی جرأت

کیسے ہو سکتی ہے! اور انہوں نے ٹانگیں چارپائی تک پھیلا دیں۔ تب نووارد نے پاس آکر کہا۔ "صبح چار بجے جب سیٹھ جی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو جاتے ہیں۔ اس وقت ان پہ فائر کیا جائے گا"

سپرنٹنڈنٹ چونک کر اور چست ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے پوچھا۔۔۔ "کون سیٹھ"؟

نووارد نے کہا۔ "میں نے ابھی آپ کو بتایا۔ سرمایہ داروں کی انجمن کے صدر سیٹھ بہاری لال!"

"مجھے بے حد افسوس ہے"۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا "میں نے تمہاری بات نہیں سنی۔ کون ان کو قتل کرنا چاہتا ہے"؟

"انقلاب پسند!"

سپرنٹنڈنٹ صاحب کی سب آلس دور ہو گئی۔ انہوں نے کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ کر تفصیل سے سب بتاؤ"

نووارد نے کہا "مزدوروں کی ہڑتال کے طوالت اختیار کرنے سے ان میں بہت بے چینی پھیل رہی ہے۔ اور انقلاب پسندوں کے ایک خفیہ گروہ نے ان کی تکالیف کا بدلہ لینے کے خیال سے سرمایہ داروں کی انجمن کے سب ممبروں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فی الحال وہ صدر پر وار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہی سمجھوتہ ہونے کے راستہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں"

"ہوں!" اور کچھ سوچ کر سپرنٹنڈنٹ نے تشویش سے کہا۔

"معاملہ اتنا سنگین ہے! تو کتنے انقلاب پسند ہونگے؟"

"دو، ایک میں اور کوئی دوسرا"

"تم"

نووارد ایک معنی خیز ہنسی ہنسا۔"مجھ سے زیادہ مت پوچھئے۔۔۔ کئی پرانے انقلاب پسندوں کا اس گروہ میں ہونے کا شبہ ہے۔ جان پر کھیل کر میں یہ راز حاصل کر رہا ہوں۔ اور تب تک آپ کچھ بھی نہ پوچھئے۔ جبتک سب کو گرفتار نہیں کر لیا جاتا"۔

سپرنٹنڈنٹ چپ رہے۔

"اور میری حفاظت کے لئے کچھ سپاہی تعینات کر دیجئے"۔

سپرنٹنڈنٹ نے استفسار کے انداز میں نووارد کی طرف دیکھا۔

"ویسے تو پستول میرے پاس بھی ہے" نووارد نے ذرا ہنسکر کہا "لیکن گروہ بڑا خطرناک ہے۔ جو اس انجمن کا کوئی راز بھی فاش کر دے۔ اسے گولی سے اڑا دیا جاتا ہے"۔

اضطراری طور پر سپرنٹنڈنٹ نے رومال سے پیشانی کو پونچھا۔ اور کہا۔

"میں ٹیلیفون کر دونگا" اور پھر پوچھا "کہاں حملہ کیا جائے گا"۔

"باغ کے پچھلی طرف، پانی کے نل کے پاس"

"کتنے سپاہیوں کی ضرورت ہے"۔

"دو کافی ہونگے"

"دو؟"

"اور وہ بھی سیاہ پوشاک میں۔ ذرا بھی شک ہو گیا تو شاید وہ وار ہی نہ کریں پھر تیسرا میں اور چوتھے۔ آپ ہونگے"۔

"مجھے بھی چلنا ہو گا"۔

"چلیں تو اچھا ہی رہیگا"

"ٹھیک ہے" سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔ اور پاس ہی میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل سے ایک پیگ حلق میں انڈیل لیا۔

نووارد نے کہا "تو علے الصبح چار بجے آپ وہاں تیار رہیئے گا"۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے سر کے اشارے سے یقین دلایا کہ وہ ضرور وہاں تیار ملیں گے۔

نووارد نے پھر کہا۔ "ذرا سی غفلت سے بھی جان پر بن سکتی ہے" اور ہاتھ ملا کر وہ باہر آگیا۔

باہر باغ میں اسے پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پستول نکال کر وہ کچھ لمحوں کیلئے وہیں اندھیرے میں رُک گیا۔

لیکن کوئی نہ تھا۔ اور پھاٹک پر سپاہی بدستور پہرہ دے رہا تھا۔

برسات کی بھیگی بھیگی مستانہ ہوا چل رہی تھی۔ اور پھولوں کی خوشبو نے اسے معطر بنا دیا تھا۔

دور کسی گھڑیال نے چار بجائے۔ اور دو نقاب پوش جلدی جلدی باغ کے پچھلی طرف بڑھے۔

"ہم"

"ہاں"!

"فائر تم کرو گے"؟

"ہاں"!

"اور میں"؟

"تم میری امداد کرنا۔ اگر نشانہ چوک جائے تو فائر تم کرنا"!

"تم یہاں کتنی دیر سے ہو"؟

"ابھی آیا تھا"

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

"تمہیں ڈر تو محسوس نہیں ہوتا"؟

"ڈر"!

"یہ کام خطرناک ہے"۔

"شاید"!

"سیٹھ نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے"؟

"میرا"! ہم ہنسا " انفرادی طور پہ میرا چاہے کچھ نقصان نہ ہوا ہو لیکن اتنے غریب مزدوروں کو جس کے وجود سے دن رات تکلیف ہو رہی ہے اسی کے وجود سے انسان ہونے کے ناطے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے"؛

"سیٹھ بھی تو انسان ہے"!

ہم پھر ہنسا۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی " ایسا ہوتا تو تمہیں اور

مجھے یوں رات کی تاریکی میں چھپ کر پستول تھامے نہ آنا پڑتا۔ لیکن تم یوں باتیں کر رہے ہو، جیسے تمہیں خوف محسوس ہو رہا ہو؟"

"خوف!" ۲۴ ہنسا

دونوں اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں انہیں چھپ کر سیٹھ کا انتظار کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اور درختوں کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ۲۴ نے پھر آہستہ سے کہا۔۔۔ "۳۷"

"ہاں"

"میں کہتا ہوں۔ سردار ہمیں کونسی چیز دیتے ہیں۔ جس کے کھانے سے ہماری آوازیں بدل جاتی ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم"!

"سردار خود کیوں کسی ایکشن میں حصہ نہیں لیتے"؟

"گروہ ان کے بغیر منظم نہیں رہ سکتا۔"

دونوں کچھ لمحہ چپ چاپ انتظار کرتے رہے، پھر ۲۴ نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے"؟

"۳۷"

"میں نام پوچھتا ہوں"

"تمہیں معلوم ہے ہمیں نام بتانے کی اجازت نہیں۔"

"لیکن۔۔۔۔۔۔"

لیکن اس وقت گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی سیٹھ صاحب اپنے

گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ اسے بھگاتے چلے آرہے تھے۔ اور ان کے پیچھے ان کا سائیس پاپیادہ بھاگا آرہا تھا۔

اگرچہ انہیں کہا گیا تھا۔ کہ صرف دو سپاہیوں ہی کی ضرورت ہے۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب پوری گارد کے ساتھ تین بجے ہی سے چھپے ہوئے تھے۔

زاٹ...... زاٹ......

دو فائر ہوئے اور گھوڑے سے سیٹھ صاحب کے گرنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی سائیس کی چیخ فضا میں گونج اٹھی۔ گھوڑا سرپٹ بھاگا۔

۷۳ تیسرا فائر کرنے ہی والا تھا۔ کہ اس کے ساتھی نے اس کا بازو تھام لیا۔

"غدار!"

"تم!"

سپرنٹنڈنٹ صاحب پہنچ گئے۔ نوجوان نقاب پوش کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ ایک آدمی سیٹھ جی کی طرف بھاگا۔ گولی ان کے شانے سے پار ہو کر نکل گئی تھی۔ اور خون بہہ رہا تھا۔

"دیپو......" ۴۲ چونکا۔

"غدار" ـــــ پاس ہی سے ایک اور آواز آئی۔ ساتھ ہی دو فائر ہوئے اور ۷۳ اور ۴۲ زمین پر لوٹنے لگے۔

"زاٹ......"

پھر ایک فائر ہوا، اور کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی سپاہی اس طرف بھاگے۔

"دیپو میں تمہارا قاتل، تمہارا باپ......

مگر، ۴۲ مر چکا تھا۔ اس کا نقاب ہوا سے الٹ گیا تھا۔ اور سڑک کے لیمپ کی روشنی میں ۴۲ نے دیکھا اس کا اپنا بیٹا دیویندر، وہ خوش فکر شاعر خون میں لتھڑا ہوا بےحس و حرکت پڑا ہے۔

تبھی سپاہی ایک نقاب پوش عورت کی نعش کو اٹھائے ہوئے لائے اور اسے دونوں کے پہلو میں لٹا دیا۔

"تم...... تم......!" ۴۲ کی ہراس انگیز آواز فضا میں گونج اٹھی۔

"باپ اور بھائی کی قاتل تم کنتی......

اور اس کا رشتۂ حیات ٹوٹ گیا۔

ہوا تیز چلنے لگی۔ اور مغرب میں بجلی کڑ کڑ کر کے کڑک اٹھی۔

خاموش شہید

لاہور
جولائی ۱۹۲۹ء

”شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے“

ٹھیک! لیکن کتنے ایسے شہید ہیں، جن کی چتاؤں پر

میلے تو کیا، کوئی بھولا بھٹکا پنچھی بھی پر نہیں مارتا۔

شمبھو نے دل میں پختہ عہد کر لیا — میں لگان نہ دونگا۔

بارش نہ ہونے کی وجہ سے اس کی فصلیں تباہ ہو گئی تھیں۔ اس کا گھر مفلسی کا اڈا بن گیا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھوک کی شدت سے موت کی طرف سرک رہے تھے۔ اس پر لگان کی عدم ادائیگی نے زمیندار کی سختیوں کو بھی دعوت دے دی تھی۔

لوگوں نے اسے بہتیرا سمجھایا۔ پڑوسیوں نے قرض لینے میں اس کی

امداد کرنے کا وعدہ کیا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے ساہوکار نے لگان کی رقم دو آنہ روپیہ کے معمولی سود پر دینی منظور بھی کر لی۔ لیکن شمبھو نہ مانا۔ اس نے کہا ــــ جس درخت کی جڑ ہی کٹ گئی ہو۔ وہ پھل کہاں سے لائیگا؟ اور اسی لئے نہ اس نے ساہوکار سے قرض لیا اور نہ لگان دیا۔

زمیندار کے کارندوں نے اس کی زمین چھین لی۔ جھونپڑی نیلام کر دی برتن بھانڈے بیچ ڈالے اور اسے بالکل بے خانماں برباد بنا ڈالا۔

وہ خاموش رہا۔ صبر کا گھونٹ پی کر برداشت کرتا رہا۔ اس نے ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا۔ اس ظلم کے خلاف احتجاج کے طور پر اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اور ہمسائے بھی اسے اس اقدام سے نہ روک سکے۔

شام کا وقت تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ اور تند ہوا کے جھونکے جسم میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔

اس کی بھوک ہڑتال کو بندرھواں روز تھا۔ اور وہ سوکھ کر کانٹا رہ گیا تھا۔ لیکن اس پر بھی زمیندار کا من نہ پسیجا تھا۔ اس تک شاید اس بات کی خبر بھی نہ پہنچی تھی۔

اور اس وقت جب مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور رات آہستہ آہستہ کائنات پر چھانے لگی تھی، آسمان کے سائبان تلے۔ فرشِ خاک پر ٹھٹھرتے ہوئے، بھوکے بچوں کے درمیان، اس کی روح جسم کی قید سے آزاد ہو گئی۔

ہمسایوں نے اس کے جسم کو دریا کی نذر کر دیا۔ اس کی ارتھی کا کوئی جلوس نہیں نکلا۔ اخباروں میں اس کی اس قربانی کی خبر تک نہ چھپی۔ اور ملک تو کیا گاؤں تک میں اس کا ماتم نہ کیا گیا۔

کیا وہ شہید نہ تھا؟

مایا

لاہور

نومبر ۱۹۳۶ء

کبیر نے کہا۔ مایا مہا ٹھگنی ہم جانی۔
لیکن 'مایا' صرف پرماتما کی ہی مایا کا نام نہیں۔ دولت اور
عورت کو بھی تو مایا کہا جاتا ہے۔
پر کبیر کا مطلب شاید ان تینوں ہی سے تھا۔

یہ بھی کوئی بات ہے —— لالہ تیج بھان بولے —— میں ایک حسینہ سے صرف دس منٹ کے لیئے ملا۔ لیکن آج تک اس کی یاد کو دل سے فراموش نہیں کرسکا۔ کون کہہ سکتا ہے —— میں اس سے محبت نہیں کرتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ محبت تب ہی بڑھتی ہے۔ جب میل جول بڑھتا ہے۔ میں کہتا ہوں محبت کے بازار میں ملاقاتوں کی اتنی قیمت نہیں جتنی دل کی ہے۔ میں ان چند لمحوں کی یاد کو آج بھی کنجوس کے دھن کی طرح سینے میں چھپائے ہوئے ہوں۔ اور کون جانتا ہے وہ بھی ایسا نہ کرتی ہو گی؟

وسنت بولے ـــــ صرف دس منٹ؟

"بلکہ اس سے بھی کچھ کم!ـــــ لالہ جی نے کہا، اور پھر بولے ـــــ

"یہ ۱۹۲۹ کی بات ہے۔ ان دنوں لاہور میں کانگریس کے اجلاس کی دھوم دھام تھی۔ تمھیں یاد ہوگا۔ کانگریس کی کارروائی کے شروع ہونے سے کچھ دن پہلے بارش ہوئی تھی۔ بس اسی دن کا ذکر ہے۔ میری کار ہوا سے باتیں کرتی ہوئی منٹو پارک والی سڑک پر اڑی جارہی تھی کہ جھپاکے کے ساتھ بارش آگئی اور دیکھتے دیکھتے زور کا مینہ برسنے لگا۔ میں سیٹ میں پیچھے کی طرف لیٹا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ ایک دم کار رُک گئی۔ میں آگے کو گرا۔ ذرا بیزاری سے میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور پوچھا ـــــ "کیا بات ہے؟

لیکن اس سے پیشتر کہ وہ جواب دیتا کار کی دائیں کھڑکی کے پاس ایک خوبصورت۔ نازک اندام حسینہ آکھڑی ہوگئی۔ ہوا سے اس کی ساری سر سے اڑی جارہی تھی۔ اور وہ بار بار اسے سر پہ اوڑھنے کی ناکام کوشش کرتی تھی ـــــ میں نے بسرعت تمام کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ شاید ڈرائیور نے اسی کے اشارے پر کار روک لی تھی۔

ـــــ کیا آپ مجھے کانگریس نگر تک پہنچانے کی تکلیف کرینگے؟

میں نے جواب دینے کی بجائے دروازہ کھول دیا۔ وہ بلا تکلف سیٹ پر آبیٹھی اور شیشہ چڑھاتے ہوئے بولی۔

ـــــ بارش آئی بھی تو جھپاکے کے ساتھ

مجھے جانا تو مال پر تھا۔ لیکن میں نے کہا ـــــ کوئی بات نہیں میں بھی

اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ وہ مسکرائی۔ میٹھی کیف زا مسکراہٹ! میں نے اس کی طرف دیکھا اور اگرچہ آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ کسی اونچے گھرانے کی لڑکی ہے۔ موٹروں میں بیٹھنا جانتی ہے۔ پڑھی ہوئی اور تربیت یافتہ ہے۔ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کی غرض سے آئی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے رنجیت سنگھ کی سمادھ دیکھنے سہیلیوں کے ساتھ گئی تھی۔ وہ قلعہ دیکھنے چلی گئیں۔ اسے کام تھا۔ اس لیے واپس چل کھڑی ہوئی۔ ابھی یہاں تک پہنچی تھی کہ بارش آگئی۔

میں نے اسے کانگریس نگر کے دروازے پر اتار دیا۔ اب بارش تھم گئی تھی۔ مختصر سا بادل تھا جو کچھ لمحوں کے لیے آیا اور چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اترا۔ اس نے کہا — میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ اگر آپ کار کھڑی نہ کر لیتے۔ میری کیا حالت ہوتی؟

میں نے ذرا ہنس کر کہا — نہیں نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔ مجھے بھی تو اِدھر ہی آنا تھا۔

میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی — اور نمستے، کہہ کر وہ تیزی سے چلی گئی۔ میں کھویا سا کار میں آ بیٹھا۔ جب کار چلنے لگی۔ تو میں نے دیکھا کہ جہاں وہ بیٹھی تھی۔ وہاں کونے میں ایک خوبصورت رومال پڑا ہے — ٹھہرو! میں نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا اور کھٹ سے دروازہ کھول کر اترا۔ لیکن وہ دکھائی نہ دی۔ میں کچھ قدم آگے بڑھا۔ نہ جانے وہ کہاں، کس طرف مڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ کچھ لمحے میں چپ چاپ کھڑا سوچتا رہا۔ پھر رومال کو

احتیاط سے تہ کر کے۔ دونوں ہاتھوں میں دبائے واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا۔ اور کار سٹارٹ کر دی۔ تب تنہائی میں میرے دونوں ہاتھوں میں دبا ہوا رومال آہستہ آہستہ میرے ہونٹوں سے آلگا۔ کار تیزی سے چلنے لگی۔ کانگرس نگر، اس کا شور وشغب، بھیڑ بھاڑ سب دور ہوتے گئے۔ موٹر، گاڑیاں، چھکڑے، تانگے، اور سڑک کے دو رویہ کھڑے درخت سب تیزی سے گذرتے گئے۔ کار میرے مکان کے پاس آکر کھٹ سے رُکی، تب میں اپنی محویت سے جاگا۔

اگرچہ اس واقعہ کو دس سال ہو گئے ہیں — لالہ تیج بھان نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ لیکن میں اس کی یاد کو دل سے محو نہیں کر سکا اور آج تک میں محسوس کر تا رہا ہوں کہ میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔

میں نے پوچھا — تو پھر اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی۔

— جتنے دن کانگرس رہی وہاں جاتا رہا۔ لیکن شاید اس نے پھر وہ ساری ہی نہیں پہنی۔ اور چونکہ میں پہلی بار اسے اچھی طرح دیکھنے کا حوصلہ نہ کر سکا تھا۔ اس لئے اگر وہ کہیں ہو گی بھی تو میں اسے نہیں پہچان سکا۔

میں ہنسا۔ وسنت بولے — تم نے رومال کی بات کہی تو مجھے بھی رومال کا ایک واقعہ یاد آگیا۔

ہم اشتیاق سے کرسیوں پر ذرا آگے کو جھک گئے۔ نوکر سے میں نے چائے کے کپ وغیرہ اٹھا لے جانے کو کہا۔ دسمبر کا مہینہ تھا کافی سردی پڑنے

لگی تھی۔ اس دن آسمان پر کچھ بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔ سامنے کھڑکیوں کے شیشوں سے دور تک چھائی ہوئی کالی گھٹا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ شاید باہر ہوا بھی چل رہی تھی۔ ٹھنڈی اور زہر کی طرح چبھ جانے والی — لیکن کمرہ گرم تھا۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ وسنت بولے — میری کہانی سیدھی سادی سی ہے۔ نہ تو اس کا آغاز اتنا رومان انگیز ہے اور نہ انجام۔ تم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ابتدا ہی سے کانگریسی ہوں۔ آج تو میں صوبجاتی اسمبلی کے لئے امیدوار ہوں۔ لیکن لاہور کانگرس کے موقع پر میں ایک حقیر والنٹیر تھا۔ ہماری ڈیوٹیاں عموماً بدلتی رہا کرتی تھیں اور بارہا ایسا ہوتا تھا۔ کہ لیڈی والنٹیروں کی اور ہماری ڈیوٹیاں ایک ہی جگہ لگ جاتیں مجھے ان میں سے ایک سے ذرا دلچسپی ہو گئی۔ گوری۔ نازک اور شوخ سی وہ لڑکی میری آنکھوں میں کھب گئی۔ اور میں اس سے باتیں کرنے کو بے چین ہو گیا۔ دن میں کئی بار ہمارا سامنا ہوتا۔ اور وہ ایک بار میری طرف دیکھ کر تیزی سے نکل جاتی لیکن باتیں کرنے کا موقع نہ ملتا۔ جب کانگرس کے اجلاس کی کارروائی باقاعدہ شروع ہوئی۔ تو میں نے کوشش کر کے ہر اس جگہ ڈیوٹی لینا شروع کر دیا۔ جہاں وہ ہوتی۔ ایک دن باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ پنڈال میں صرف لیڈی والنٹیروں کا پہرہ تھا۔ اندر کسی والنٹیر کو بھی جانے دیا جاتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اندر کے گیٹ پر تھی کارروائی شروع ہو گئی۔ لیکن مجھے اندر جانے کا موقع ملا۔ میں باہر کھڑا کتنی دیر تک سوچتا رہا میرے دیکھتے دیکھتے ایک سکاؤٹ پانی کا گلاس لے کر اندر گیا۔ اور پانی پلا کر آ گیا۔

سکاؤٹوں کا کام لیڈروں کو کھانا کھلانے تک محدود تھا۔ اور وہ اپنے کمشنر کے ماتحت کام کرتے تھے۔ کانگرسی والنٹیروں سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کو پنڈال کے اندر جاتے اور باہر آتے دیکھ کر مجھے ترکیب سوجھ گئی۔ میں لنگر خانے سے ایک چھوٹی سی بالٹی اور گلاس لے آیا۔ نلکے سے اس میں تھوڑا سا پانی بھر لیا اور دور سے بھاگتا ہوا آیا۔ گیٹ پر لیڈی والنٹیروں کی کپتان خود ٹکٹ چیک کر رہی تھیں۔ ان کا دھیان دوسری طرف تھا۔ میں تیزی سے ان کے پاس سے گذرا۔ انہوں نے روکا۔ میں نے یونہی ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ پانی مانگ رہے ہیں" اور رُکے بغیر بڑھ گیا۔ دکھانے کے لئے میں ایک دو وزیٹروں کو پانی پلانے لگا۔ کپتان صاحبہ دوسرے آنے والوں کو چیک کرنے میں منہمک ہو گئیں۔

اس دوران میں ان دیوی جی کو بھی پیاس لگی۔ انہوں نے مسکرا کر پانی مانگا میں نے گلاس بھر کے دے دیا۔ پی کر انہوں نے کہا "شکریہ" میرے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور میں اُس کو دیکھتا رہ گیا۔ وقفہ میں لوگ باہر جانے لگے گیٹ پاس ختم ہو گئے۔ کپتان صاحبہ چلائیں — مہربانی کر کے کچھ پاس لائیے! میں بھاگ کر اُس کے پاس ہی گیا اور لکنت آمیز لہجہ میں میں نے گیٹ پاس مانگے۔ وہ مسکرا دی اور دھیرے سے اس نے پاس میری طرف بڑھا دیئے پاس لیتے وقت میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک لمحہ کے لئے اس نے پاس اپنے ہاتھ میں روک رکھے۔ مجھے ایک غیر معمولی خوشی کا احساس ہوا۔ اور جیسے اڑتا ہوا میں پاس لے آیا۔ شکریہ تک ادا کرنا بھی بھول گیا۔

پاس گیبٹ پر دے کر میں پھر اس کے پاس گیا۔ اور میں نے آہستہ سے کہا
—— کپتان صاحبہ آپ کا بہت شکریہ ادا کرتی ہیں وہ ہنس دی۔ میں بھی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ آہستہ سے میں نے کہا —— اور میں بھی!
آپ کے شکریے کی ضرورت نہیں —— اس نے منہ پھیر کر کہا۔ ہم دونوں مسکرا دیئے۔

اس طرح ہمارا تعارف ہوا۔ اور پھر ہم میں ارتباط بڑھتا گیا۔ دن بھر میں ہم کسی نہ کسی طرح باتیں کرنے کا وقت نکال ہی لیتے! ان دنوں کی یاد آج بھی دل میں ایک ٹیس سی پیدا کر دیتی ہے۔ کانگرس کے ایک ہفتہ کو گزرتے دیر نہ لگی معلوم بھی نہ ہوا اور دن بیت گئے۔ آخر وہ دن آگیا جب ہمیں ایک دوسرے کو الوداع کہنا تھا۔ اسے اپنے دیس اور مجھے اپنے دیس —— ہم دونوں دور راوی کے کنارے ملے۔ سردیوں میں سوکھی راوی جیسے اپنا سہاگ لٹا کر بیوگی کے دکھ میں لیٹی ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا اور ایک کہر سا اٹھ کر سب طرف چھا رہا تھا۔

میں نے کہا —— رانی تم اپنا نام اور اتا پتا تو بتا جاؤ اور کچھ نہیں تو اپنی کوئی نشانی ہی دے جاؤ۔

ایک اداس مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔ اس نے کہا —— کمار بھول جاؤ۔ زندگی فانی ہے تو پھر محبت ہی کیوں امر ہے۔ اسے ہی کیوں حیات جاودانی حاصل ہو؟ —— اتا پتا —— یہ بھی جھوٹی باتیں ہیں۔ دنیا میں کون اتا پتا لے کر آیا ہے اور کون اتا پتا کر جائیگا۔ سمجھ لینا۔ زندگی کی بہتی

ہوئی ندی ایک لمحہ کے لیے رُکی اور پھر اپنی روانی میں بہنے لگی — یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ایک رومال دیا۔ اس پر انگریزی حروف میں لکھا ہوا تھا — فارگیٹ (بھول جاؤ) دور لیڈی والنٹیروں کے کیمپ سے سیٹی کی آواز آئی۔ اس کے لرزتے ہوئے لبوں سے نکلا — بھول جاؤ! اور وہ ہاتھ جوڑ کر "دھندے" کہتی ہوئی مڑی اور چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل کو روک کر رومال کو چوم لیا۔ اور آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی دو بوندوں کو پونچھ ڈالا۔

اگرچہ اس نے کہا تھا — بھول جاؤ! لیکن کیا میں بھول سکا ہوں؟ یہ کہہ کر وسنت کمار ایک سوکھی ہنسی ہنسے۔ لالہ پنج بھان نے کہا — واہ یار بھلا میرا رومان اس ٹریجیڈی کے مقابلہ میں کیا ٹھیرے گا؟

سریندر شرما پلنگ پر کمبل لئے بڑے دھیان سے کہانی سن رہے تھے ان کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ پر کہہ نہیں پاتے۔

میں نے ذرا ہنستے ہوئے کہا — کیوں شرما جی آپ کے پاس بھی رومال کی کوئی کہانی ہے؟

کچھ لجاتے اور کچھ مسکراتے ہوئے شرما جی نے کہا — بھئی چاہے جو سمجھو لیکن میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا اور وہ بھی کانگریس کے اسی اجلاس میں۔ اور چاہے تم یقین نہ کرو لیکن اس کو بھی رومال سے کچھ

نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔

شرماجی اور محبت۔ ہم سب ذرا چوکنے ہو کر بیٹھ گئے اور ان کی کہانی سننے لگے۔ انگیٹھی کو ذرا چارپائی کے نیچے سرکا کر اور کندھوں تک کمبل اوڑھ کر شرماجی کہنے لگے ——— تم جانتے ہو ہمارے لئے تو اس لیڈری نے زندگی کے تمام لطف پھیکے کر دیئے ہیں۔ کوئی رس ہی باقی نہیں رہنے دیا۔ لوگ لیڈروں کو تو پتھر کا بت دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سے ایسے چلن کی امید رکھی جاتی ہے جو فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہو۔ پبلک سٹیج پر آنے اور کامیابی حاصل کر کے اسے بنائے رکھنے کے لئے دل کو قفل لگا کر رکھنا بے حد ضروری ہے اور میں نے ایسا کیا بھی ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے۔ میں نے اسے قابو میں رکھا ہے۔ میں نے اسے پتھر ہی بنا لیا ہے۔ پھر بھی ایسے مواقع آ جاتے ہیں۔ جب یہ موم ہو جاتا ہے اور اپنے استحکام کو چھوڑ دیتا ہے۔

کانگرس کا عام اجلاس ہو رہا تھا۔ اور میں استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں میں بیٹھا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ایک دو بار آئی۔ کبھی اس لیڈر اور کبھی اس لیڈر کے لئے کچھ لائی۔ میں اس کی چنچلتا۔ اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر کچھ مبہوت سا رہ گیا۔ وہ شاید والنٹیر تھی۔ اور دوسروں کی طرح اپنے کام میں منہمک تھی۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ اس کا یہ انہماک دوسروں کو کتنا محو کئے دیتا ہے۔ جب وہ چوتھی بار آئی تو میں نے اسے بلا یا اور اس سے کسی والنٹیر سے پانی لانے کے لئے کہنے کی درخواست کی۔ کسی دوسرے کو کہنے کی بجائے وہ خود ہی پانی لے آئی۔ پانی پیتے پیتے میں نے اس سے اس کے

نام اور کیمپ وغیرہ کے بارے میں سب باتیں پوچھ لیں۔ گلاس لے کر وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ فطری تھی۔ اور وہ انجانے ہی دوسروں کو لبھا رہی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کا میرا سامنا ہوا۔ جہاں بھی وہ مجھے ملی اس نے مسکرا کر "نمستے" کہی جس دن پنڈت جواہر لال نے مکمل آزادی کے نصب العین کا اعلان کیا۔ اس کے دوسرے دن کپتیان صاحبہ نے ہمیں سب کیمپ دکھلائے۔ ہم اس کے کیمپ میں بھی گئے۔ اس وقت وہ اپنا اٹیچی کیس کھول کر کچھ ڈھونڈ رہی تھی اور اس کے کاڑھے ہوئے کچھ رومال دری پر بکھر گئے تھے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی اس نے "نمستے" کہی میں نے پوچھا — یہ رومال تم نے ہی کاڑھے ہیں؟

جی — اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک رومال اٹھا لیا۔ ایک کونے میں لکھا ہوا تھا "بابا" میں نے اسے تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا — یہ تو ہمیں دے دو!

— آپ لے لیجئے!

اور ہم باہر آگئے۔ میرے ساتھی لیڈر نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا — کیوں بھئی! لیکن میں اس وقت کسی دوسرے شخص سے ایک سیاسی معاملہ پر اس جوش سے گفتگو کر رہا تھا۔ کہ میرے پاس ان کی اس "کیوں بھئی" کا جواب دینے کے لئے وقت نہ تھا۔

گھر آکر میں نے اس رومال کو پھر کھولا۔ دیکھا۔ اور ایک لمبی سانس لے کر رکھ لیا۔ اس وقت پہلی بار میں نے چاہا — کاش میں لیڈر نہ ہوتا۔

شرما جی کی کہانی کے بعد کچھ لمحوں کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

تینوں شاید اسمبلی کے انتخابات کو بھول کر اپنی اپنی دنیا میں گم ہو گئے تھے

آخر میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا

—— تو اس کا نام "مایا" تھا۔

—— دیکھ لو صاف لکھا ہے۔ شرما جی نے رومال نکال کر رکھ دیا۔

ایک فوری جذبے کے ماتحت لالہ بنج بھان اور مسٹر وسنت کمار نے بھی رومال نکالے۔ ان دونوں کے کونوں میں بھی باریک سا "م" بنا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔

تینوں لیڈروں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

زندگی کا راز

لاہور

فروری ۱۹۳۳ء

الوالعزم چیلے نے گورو سے پوچھا۔ مہاراج زندگی کا کیا راز ہے؟
گورو نے ایک بار آنکھیں کھول کر کہا۔ "موت!" اور پھر
آنکھیں بند کر لیں۔

دریا کے کنارے بیٹھا شب دیال اپنے خیالات کی دنیا میں کھو گیا تھا
دور افق میں لال بدلیاں نیلی ہو گئی تھیں۔ اور مٹیالے رنگ نے آسمان
پر پوری طرح اپنا تسلط جما لیا تھا۔ دریا کے کنارے اخمدار شیشم کی ٹہنیاں
جیسے ابتدائے آفرینش سے دریا کی لہروں کو پکڑنے کی ناکام کوشش
میں مصروف تھیں۔ اور لہریں امواجِ زندگی کی طرح متواتر بہے جا رہی تھیں۔
اس وقت نارائن نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
شب دیال کی محویت کے تار ٹوٹ گئے۔ اس نے سر اٹھا کر نارائن

کی طرف دیکھا۔

نارائن نے کہا "اٹھو، رات ہو رہی ہے، چلو گے نہیں؟"

"چلونگا" اور یہ کہکر تھکے ہوئے شخص کی طرح شب دیال اٹھا اور نارائن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چپ چاپ چل پڑا۔

راستہ میں نارائن نے کہا "کل سیٹھ رام لال کے کارخانہ میں زبردست ہڑتال ہو گی۔ چلو گے؟"

خواب کی سی حالت میں شب دیال نے مسکرا کر کہا "چلونگا۔ کیوں نہیں"؟ اور پھر وہ اپنے خیالات کی دنیا میں محو ہو گیا۔

نارائن صوبے کا مشہور شاعر تھا۔ اس تھوڑے سے عرصے ہی میں اس نے خاص و عام کے دل میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ اس کے شعر ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ اور پڑھنے اور سننے والوں کو خوابوں کی ایک رنگین، رومان بھری دنیا میں لے جاتے تھے۔ جہاں ماضی، حال اور مستقبل کے بندھن ٹوٹ جاتے اور وہ سپنوں کی اُس دنیا میں شعروں کی شراب پی کر مدہوش ہو رہتے۔

شب دیال اس کا دوست تھا۔ دونوں بچپن سے ایک ساتھ کھیلے، کودے۔ بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ دونوں کے مذاق قریباً ایک جیسے تھے۔ دونوں خوابوں کی دنیا میں بسنے والے، دونوں شاعر مزاج! فرق صرف یہ تھا۔ کہ نارائن شعر کہتا تھا اور شب دیال سنتا تھا۔ نارائن صرف اس وقت تک اس رومان انگیز دنیا کی سیر کرتا جب تک اس کے جذبات الفاظ

کی شکل اختیار نہ کرتے شب دہاں انہیں پڑھ پڑھ کر آٹھوں پہر جھوما کرنا مطلب یہ کہ ایک شعر کہنا اور بھول جانا۔ دوسرا اُنہیں پڑھنا اور لوحِ دل پر نقش کر لینا۔

شہر کے باہر نئی سڑک پر سیٹھ رام لال کے کارخانے تھے۔ دو رویہ دور تک کارخانوں کی دیواریں چلی گئی تھیں۔ ایک طرف کپڑے کا کام ہوتا تھا اور دوسری طرف ٹین کا اور ہزاروں مزدور ان دونوں دھندوں میں دن رات لگے رہتے تھے۔

سنتے ہیں اُن کے دادا بھیک مانگتے آئے تھے۔ لیکن قسمت تھی کہ لاکھوں کے مالک بن گئے۔ شروع شروع میں گلی محلّوں سے پرانے ٹوٹے پھوٹے برتن اکٹھے کیا کرتے اور بازار میں کچھ نفع پر انہیں فروخت کر دیتے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے کپڑوں کی دوکان کھولی۔ محنت اور دیانتداری سے کام کرتے تھے چل نکلی اور پہلے سال ہی کافی منافع رہا۔ پھر آپ ہر سال کام بڑھاتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ نے شہر کے باہر سستی زمین مول لے کر وہاں نہایت چھوٹے پیمانے پر بالٹیاں بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اسی دوران میں جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ ان کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا۔ فوج میں بالٹیاں سپلائی کرنے کا ٹھیکہ انہیں مل گیا۔ اور قلیل عرصہ کے اندر اندر ایک اچھے کارخانہ کے مالک بن گئے۔ لیکن اس ترقی سے ان کے دل پر میل تک نہیں آئی۔ ان کی سادگی اور تواضع اسی طرح قائم رہی۔ اور محنت اور دیانت میں بھی مرتے دم تک فرق نہ آیا۔

سیٹھ رام لال کے باپ نے بھی غریبی کے دن دیکھے تھے۔ اس لئے جب ان کے والد کارخانہ ان کے نام چھوڑ کر مرے تو اُن کے دماغ میں خلل نہیں آیا بلکہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ ترقی کے راستہ پر گامزن رہے۔ اپنے باپ کے ساتھ انہوں نے مزدوروں کی طرح کام کیا تھا۔ اور اُنہیں مزدوروں کیساتھ ہمدردی بھی تھی۔ اس لئے ان کے عہد میں مزدوروں کو کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن کے دُکھ کو انہوں نے اپنا دُکھ جانا۔ کام بھی اُن کا بڑھا۔ سڑک کی دوسری طرف انہوں نے کپڑے کا ایک کارخانہ کھول دیا۔ اور جس وقت مرے تو اپنے لڑکے رام لال کے لئے لاکھوں کی جائداد چھوڑ گئے تھے۔

رام لال بچپن ہی سے سیٹھ پیدا ہوئے تھے۔ غریبی اور مفلسی کیا ہوتی ہے انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ بچپن ہی سے انہوں نے دوسروں کو اپنے لئے کام کرتے پایا۔ اور اس وقت جب ۳۰ سال ہی کی عمر میں وہ اپنے باپ کے فوت ہونے پر اتنی بڑی جائداد کے واحد مالک بن گئے۔ تو ان کے غرور اور تکبر کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے۔ خدا نے انہیں دولت مند پیدا کیا ہے۔ اور ان کے نیچے کام کرنے والوں کو غریب۔ پرماتما کی خوشی اسی میں ہے کہ وہ ان کے لئے کام کریں۔ اور وہ ان سے کام لیں۔ غریب مزدوروں سے انہیں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ لیکن اس غرور اور تکبر میں انہوں نے روپیہ بگاڑا نہیں۔ اسے انہوں نے بڑھایا ہی۔ ہاں دھن دولت بڑھانے میں انہوں نے جائز اور ناجائز ذریعے کا کبھی خیال نہیں کیا۔ ۱۹۲۱ کی تحریکِ عدم

تعاون میں انہوں نے خوب ہاتھ رنگے۔ اور اب پھر جب کہ دس سال بعد سودیشی کی تحریک کو فروغ مل رہا تھا۔ وہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن اسی وقت مزدوروں میں دس سال سے آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اور وہ ہڑتال کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

بات یہ تھی کہ اقتصادی کساد بازاری کا دور دورہ تھا۔ اور سیٹھ صاحب نے اسی بہانے مزدوروں کے گلے پر چھری پھیرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُن کی تنخواہوں میں تخفیف کر دی گئی تھی۔ اگر یہ تخفیف اسی تناسب سے ہوتی۔ جس نسبت سے کہ قیمتیں گری تھیں تو شائد مزدور برداشت کر لیتے لیکن یہ تھی ۳۰ فی صدی۔ اس لئے اُنہوں نے شور مچایا۔ مگر جب سیٹھ صاحب نے شور مچانے والوں کو نوکری ہی سے برطرف کر دیا۔ تو ان کے صبر اور ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور مزدور یونین نے عام ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

سیٹھ صاحب نے پولیس کو بلا لیا تھا۔ ایک طرف پولیس کے سپاہی تھے مسلح اور باوردی۔ دوسری طرف مزدور تھے تار تار کپڑوں میں ملبوس اور غیر مسلح! ایک طرف طاقت کا مظاہرہ تھا دوسری طرف بے کسی کی نمائش!! جو مزدور مل کے اندر جانے کی کوشش کرتا وہ اس کی منت سماجت کر کے اسے کام پر جانے سے منع کرتے اور اگر اس پر بھی وہ نہ مانتا تو اس کے پاؤں پر سر رکھ دیتے۔ احاطے کے اندر کھڑے سیٹھ رام لال دانت پیس پیس کر رہ جاتے۔

کچھ دیر تک پکٹنگ پر امن طور پر جاری رہی۔ اس دوران میں ایسے

بھی سو اقع آ گئے۔ جب معلوم ہؤا کہ ان کا نظام ٹوٹ جائے گا۔ مزدوروں میں ایسے بھی تھے جن کے پاس شام کے کھانے کے لئے دو پاؤ آٹا بھی نہ تھا اور یونین ابھی اتنی مضبوط نہ تھی — مزدوروں کا ایک جتھا اندر جانے کے لئے مصر ہؤا۔ ہڑتالیوں کی منت سماجت، یہاں تک کہ ان کے پاؤں پڑنے کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہؤا۔ تب ہڑتالی زمین پر لیٹ گئے۔ کہ جانا چاہو تو بھلے ہی ہمارے جسموں کو لتاڑتے ہوئے گذر جاؤ! اپنے ان بھائیوں کو، جو سب کے لئے لڑ رہے تھے۔ روند کر گذرنا انہیں منظور نہ ہؤا۔ بھلے ہی بال بچے فاقوں مریں، بھلے ہی پانی پی پی کر گذارا کرنا پڑے۔ لیکن اتنا ظلم تو ان سے نہ ہو سکیگا۔ اور وہ چپ چاپ واپس ہو گئے۔ ہڑتالیوں نے زور سے نعرہ بلند کیا "مزدور زندہ باد" اور پکیٹنگ بدستور زور شور سے جاری رہی۔

سیٹھ صاحب پولیس سب انسپکٹر سے ملے۔ گُپ چُپ سرگوشیاں ہوئیں آخر واپس آ کر انہوں نے اپنے نجی ملازموں کو اکٹھا کیا۔ حقِ نمک ادا کرنے کا یہی وقت ہے یہ بات انہوں نے ان کے ذہن نشین کر دی اور ایک ایک مہینہ کی تنخواہ زائد دینے کا وعدہ کیا اور انہیں کہا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ اور جب واپس آنے پر انہیں روکا جائے تو لڑ پڑیں۔ بلوہ کر دیں اور ہو سکے تو ایک دو اینٹیں سپاہیوں کی طرف بھی پھینک دیں۔

وفادار نوکروں نے ایسا ہی کیا۔ پولیس پر اینٹیں پھینکی جائیں اور وہ خاموشی سے برداشت کر لے۔ تو پھر وہ پولیس کیسی؟ عدم تشدد ہو سکتا ہے ہڑتالیوں کا ہتھیار ہو، لیکن اس کا تو نہیں۔ اس کے پاس تو لاٹھی ہے اور اس حربہ کا استعمال

کرنے میں۔ اس نے کوتاہی نہیں کی۔

پولیس کی لاٹھیوں کو جنبش ہوئی۔ بہتوں کے سر پھٹے، بہت زخمی ہوئے، بہت بھاگ گئے۔ لیکن اکثر لاٹھیاں کھاتے کھاتے، زخمی ہوتے ہوتے بھی وہیں لیٹ گئے۔

بہت دیر سے شب دیال اور نارائن بھی تماشائیوں کی بھیڑ میں کھڑے تھے۔ جب مزدوروں کو زدوکوب کیا جانے لگا۔ تو شب دیال کے خواب جیسے منتشر ہو گئے۔ وہ اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور اس نے نارائن کو کندھے سے پکڑا اور بھیڑ سے نکل گیا۔ اب کے نارائن جیسے خوابیدہ کی طرح اس کے سہارے چل پڑا۔

اس دن کے بعد نارائن کی شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اس کی وہ رومان انگیز دنیا بکھر گئی۔ حقیقت کی تلخی کے اندھیرے نے جانے کب اٹھ کر اس سنہرے سنسار کو ڈھک لیا۔ جانے کس طرح، جیسے کسی جادو کے اثر سے وہ غریبوں کا، مفلسوں اور مزدوروں کا شاعر بن گیا۔ اور اس کے اشعار سرمایہ داروں کی عیش پرستیوں کا مرقع کھینچنے لگے۔ تصور کے میخانے میں خم کے خم لنڈھاتے، کسی پری پیکر نازنین کے ساتھ اجنبی سمندروں پر کشتی بڑھاتے، بادلوں اور بجلیوں کے ہوائی گھروں میں اقامت گزیں ہونے اور اپنے پڑھنے والوں کو تخیّل کی نئی نئی دنیاؤں کی سیر کرانے کی بجائے اب وہ انہیں مفلسوں کی جھونپڑیوں، مزدوروں

کی کمین گاہوں، کسانوں کے کچے گھروں کی طرف لے جانے لگا۔ خواب دیکھنے والے کی بجائے وہ دفعتہً حقیقت نگار بن گیا۔

اُس حادثہ کے دوسرے ہی دن اس نے جو نظم سرمایہ دار کو مخاطب کر کے لکھی تھی۔ وہ روزانہ "مزدور" کے پہلے صفحے پر چھپی تھی اور پھر بیسیوں دوسرے اخباروں نے اسے نقل کیا تھا۔ نظم کا عنوان تھا "شمع" اور اس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

پروانوں کو اپنی تابناک لوئیں جلائے جا!
گناہوں کی تاریکی کو اپنی روشنی سے دور رکھنے کی کوشش کر!
تو آگ ہے، کوئی تیرے نزدیک نہ آئے گا۔
تو روشن ہے، کوئی تیرے گناہ نہ دیکھے گا۔
لیکن یہ معصوم پروانے ـــــ
جلنے کے بعد تجھے بجھا دیں گے۔ اور
تیرے گناہوں کی تاریکی موت کے بعد تجھے ڈرائیگی!

نارائن اپنے کمرے میں بیٹھا، نہ جانے کن خیالات میں گم تھا، کہ کسی نے اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ نارائن نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ نووارد کے ہاتھ پر پھیرا۔ آنے والے نے اس کی آنکھیں بند کر لیں۔

نارائن قہقہہ مار کر ہنسا "شیو تمہارا بچپن کبھی دور بھی ہو گا یا نہیں؟"

اور دوسرے لمحے شب دیال نارائن کے سامنے تھا۔ اس کے ہونٹوں

پر ہلکا تبسم کھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سمندر کی گہرائی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "نارائن آج ہم نے بھی نظم کہی ہے"۔

"تم نے نظم؟" اور نارائن کا قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔ "لاؤ، دکھاؤ تو"۔ شب دیال نے جیب سے کاغذ نکال کر نارائن کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور وہ ہنستے ہنستے نظم پڑھنے لگا۔ لیکن جوں جوں پڑھتا گیا۔ اس کے چہرے سے مسرت مفقود ہوتی گئی۔ اور جب نظم ختم ہو گئی تو اس کے چہرے پر تاریک بادل سا چھایا ہوا تھا۔

نظم کیا تھی ـــ ایک منظوم افسانہ تھا۔ شب دیال کے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کا مظہر، پلاٹ مختصر تھا۔ ایک سادہ لوح جذباتی نوجوان سرمایہ داروں کے مظالم دیکھکر مزدوروں کی تنظیم کرتا ہے۔ لیکن چونکہ سرمایہ دار کا ظلم روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس لئے مزدور اس کے بس میں نہیں رہتے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے ہیں۔ اور ایک دن سرمایہ دار پر حملہ کر دیتے ہیں۔ پولیس مزدوروں کے ساتھ اسے بھی گرفتار کر لیتی ہے۔ اسے پھانسی کا حکم ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے، اس کے ناطے رشتے دار اس کے لئے روتے ہیں، لیکن وہ خوشی خوشی تختۂ دار پر چڑھ جاتا ہے۔

نارائن کا دل کانپ گیا۔ اس نے شب دیال کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویسے ہی خلا میں، جیسے تصور کے کسی حسین منظر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ نارائن نے ان کی گہرائیوں میں ڈوبنے کی کوشش کی۔ اچانک اسے شبہ ہوا، جیسے شب دیال اس کہانی کا ہیرو ہے، اور وہ خود جرم کا ارتکاب کر کے

آیا ہے۔ لیکن اس کے چہرہ پر وہی سادگی تھی۔ وہی سادہ لوحی اور پاکیزگی۔ جسے نارائن ہمیشہ سے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس نے آہستہ سے پکارا ـــــ

"شبو"!

"ہاں"!

"تمہیں معلوم ہے مجھے تم سے کتنی محبت ہے"؟

شب دیال ہنسا: "بھلا اس کے اظہار کی بھی ضرورت ہے"۔

نارائن نے لمبی سانس لی۔ "دیکھو شبو" اس نے کہا "میرا کوئی بھائی نہیں، بہن نہیں، رشتہ ناطہ کوئی بھی نہیں۔ سب کچھ تم ہی ہو۔ تم میرے بچپن کے دوست ہو، ہم جماعت ہو، ہم نشست ہو، خدا کے لئے کوئی ایسا کام نہ کرنا ....

نارائن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

شب دیال قہقہہ لگا کر ہنس اٹھا۔ "بھلا تمہیں یہ شبہ کیسے ہوا"؟

نارائن خاموش، اس کی طرف دیکھتا رہا۔

شب دیال نے پھر زبردستی ہنس کر کہا: "یہ کچھ بھی نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ اس میں اصلیت کچھ بھی نہیں"۔ اور وہ پھر ہنسا۔

"اچھا ہے، لیکن ......

"لیکن کیا"؟

"میں تمہارے بغیر شاید زندہ نہیں رہ سکتا شبو" ـــــ اس نے اداس نظروں سے شب دیال کی طرف دیکھا۔

"پاگل ہو گئے ہو نارائن"۔ اور شب دیال ہنس اٹھا۔

لیکن نارائن پاگل نہ تھا۔

دوسرے دن صبح جونہی اس نے روزانہ اخبار ہاتھ میں لیا۔ سن رہ گیا۔ پہلے صفحہ پر ہی بڑے بڑے الفاظ میں لکھا تھا۔

"مشہور کارخانہ دار سیٹھ رام لال کے قتل کا اقدام"

اور کئی ضمنی سرخیوں کے بعد خبر تھی۔

"آج شام کے وقت جب سیٹھ رام لال کلب سے واپس آ رہے تھے۔ کمپنی باغ کے نزدیک ان کی موٹر پر فائر کئے گئے۔ موٹر کا ٹائر پھٹ گیا۔ اور حملہ آوروں نے سیٹھ صاحب پر گولیاں چلائیں۔ لیکن اُن کا ڈرائیور سیٹھ صاحب کو بچانے کے لئے کود پڑا۔ اور حملہ آوروں کی گولیوں سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ موٹر کے شیشے ٹوٹ گئے اور سیٹھ صاحب کے کندھے پر بھی زخم آیا۔ حملہ آور مفرور ہیں۔"

نارائن کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ شب دیال کے گھر کی طرف بھاگا۔ لیکن وہ وہاں موجود نہ تھا۔ شام کو اس نے سُن لیا۔ شب دیال چار دوسرے ہمراہیوں کیساتھ گرفتار کر لیا گیا ہے۔

گرمیوں کی دوپہر اپنی آگ جیسی لُو کی لپٹوں سے شہر کو گھیرے ہوئے تھی۔ آگ کی جلن سے آبلہ پڑ جاتا ہے۔ لیکن دوپہر کی یہ لُو ایسی تھی۔ کہ جسم اور جسم کی رگ رگ تک جھلس جاتی۔ لیکن آبلہ دکھائی نہ دیتا۔

کمرہ بند کئے نارائن اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ صبح سے وہ یونہی پڑا تھا۔ نہانے نہ گیا تھا۔ ناشتہ کرنے نہ گیا تھا۔ کھانا کھانے نہ گیا تھا۔ جیسے اُس کی تمام قوتیں ہی سلب ہوگئی تھیں۔ تبھی اسے ایک خط ملا۔ دستخط پہچان کر بیتابی سے اُس نے کھولا۔ لکھا تھا۔

بھائی نارائن۔

محض شعر کہنے یا نظمیں لکھنے سے مفلسوں کی بھلائی نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے عملی کام کی ضرورت ہے۔ محض تصوّر کی سیر کرنے کی بجائے نارائن حقیقی دنیا میں گھومنا کہیں زیادہ ضروری ہے۔ میں نے اپنے اردگرد کے ماحول کا مطالعہ کیا ہے، اپنا لائحہ عمل بھی میں نے بنا لیا ہے۔ شاید تم اس کی تائید نہ کرو۔ لیکن میں تو اسی پر عمل کرونگا۔

شبو

کسی فوری خوف سے متاثر ہو کر نارائن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر خط کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دئے۔ اُس کی آنکھوں نے دیکھا کہ پولیس اس کی بھی تلاشی لے رہی ہے اور اس خط کو اپنے قبضہ میں کر لیتی ہے اور اسے شب دیال کے خلاف استعمال کرتی ہے ۔۔۔ وہ اٹھا۔ اس نے خط کے پرزوں کو اکٹھا کیا اور انہیں باہر باغ میں پھینک دیا۔ اور پھر وہیں ایک چارپائی پر دھنس گیا۔ اور لیٹ گیا۔ لیکن لیٹا رہنا اس کے لئے محال ہوگیا۔ وہ پھر اٹھا۔ آہستہ آہستہ، دبے پاؤں نیچے باغ میں پہنچا۔ اور سب پرزوں کو اکٹھا

کرنے لگا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے وہ چوری کا اقدام کر رہا ہو۔ سب پرزوں کو جمع کرکے وہ واپس لے آیا۔ یہ پرزے پولیس کے کس کام کے تھے، لیکن اس کے لئے یہ سب کچھ تھے۔ یہ شب دیال کی نشانی تھے۔ اس شب دیال کی، جو قتل کے جرم میں ماخوذ تھا۔ اور اس کا دوست تھا۔ بھائی تھا، رشتہ دار تھا، سب کچھ تھا۔

کمرے میں پہنچکر اس نے دونوں ہاتھوں میں جمع کئے ہوئے پرزوں کو چوم لیا۔ اور انہیں اندر ٹرنک میں احتیاط سے بند کر آیا۔

پھر وہ اسی طرح بے جان سا بستر پر لیٹ گیا۔

جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں اچانک کوئی چیز گر جانے سے ہل چل پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح شب دیال کی گرفتاری سے بھی نارائن کے دل میں ہل چل پیدا ہو گئی تھی۔ سوچ اور سمجھ کی قوتیں جیسے اسے جواب دے گئی تھیں۔ لیکن جب اسی طرح بے دلی سے پڑے پڑے اسے چند دن گذر گئے۔ اور صدمہ کا پہلا زور قدرے کم ہوا تو اس نے شب دیال سے ملاقات کی درخواست کی۔

پولیس تحقیقات میں مصروف تھی۔ درخواست مختلف دفاتر سے ہوتی ہوئی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس آئی، اور اس نے اسے نامنظور کر دیا۔

نارائن کچھ دن اپنی درخواست کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ آخر کار خود سپرنٹنڈنٹ سے ملا۔ انہوں نے کہا "مجھے افسوس ہے میں ابھی تک آپ

کی درخواست پر عمل نہیں کر سکتا۔

نارائن افسردہ ہو کر گھر واپس آیا۔ گھر آ کر اس نے ایک نظم لکھی "بیکسی" اور اس میں اس نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ دوسرے دن کئی اخباروں میں ایک ساتھ یہ نظم شائع ہوئی۔ کئی دن تک اسی نظم کا چرچا رہا۔ لوگوں نے نارائن کو 'مصورِ درد' کا خطاب دے دیا۔ نارائن ہنسا۔ نظموں سے کچھ نہ ہوگا۔ کچھ عملی کام کرنا چاہئے اور وہ باہر نکلا۔ مزدوروں کے لیڈروں سے ملا۔ پبلک کے سرکردہ سربراہوں سے ملا۔ اس نے کئی جلسوں میں تقریریں کیں۔ کئی جگہ نظمیں پڑھیں۔ اس تمام محنت کے نتیجے کے طور پر شب دیال اور اس کے ہمراہیوں کے مقدمہ کی پیروی کے لئے ایک ڈیفنس کمیٹی بنائی گئی۔ سارے صوبے سے چندہ اکٹھا کیا۔ صوبہ کے مشہور مشہور وکلا نے مقدمہ کی پیروی کی۔ چھ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ اسیسروں نے شب دیال کو بے گناہ اور دوسرے دو مزدوروں کو مجرم قرار دیا لیکن سیشن جج نے اس ریمارک کے ساتھ، کہ شب دیال ہی اس سازش کا دماغ ہے۔ تینوں کو پھانسی کی سزا دے دی۔ باقیوں کو رہا کر دیا گیا۔

لوگ اس قدر انتہائی سزا کے لئے تیار نہ تھے۔ انہیں شب دیال کی رہائی کی امید تھی۔ نارائن تو گویا اسی امید کے سہارے زندہ تھا۔ جب اس نے سیشن جج کا فیصلہ سنا تو کچھ لمحہ کے لئے سن وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔ لیکن اس کی کمر جھک گئی تھی۔ اور اگرچہ کسی نے محسوس نہیں کیا۔ لیکن اس کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفید بال نمایاں

ہو گئے تھے۔

وہاں بھی جہاں یاس کی تاریکی پوری طرح مسلط ہوتی ہے۔ امید کی کرن کبھی کبھی چمک جایا کرتی ہے۔ سیشن جج کا فیصلہ سننے کے بعد نارائن بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی، امید تھی، کہ اس کے تاریک دل میں کبھی کبھی چمک جاتی تھی۔ کون جانے ہائیکورٹ میں شب دیال بری ہو جائے؟ ڈیفنس کمیٹی نے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دی تھی۔ اور نارائن ناامیدی کے باوجود عدالت کی کارروائی کو دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ اور جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے۔ امید کی وہ شعاع بڑھ کر پھیل کر اس کے دل کو روشن کرتی جاتی تھی۔ ہائیکورٹ میں تو بارہا قتل کے مجرم بری ہو جاتے ہیں۔ پھر شب دیال سے تو یہ گناہ ہی نہیں ہوا۔ لیکن جب ہائیکورٹ نے اپیل خارج کر دی تو وہ سب روشنی جانے ایک دم کہاں مفقود ہو گئی۔ اور اس کے دل میں پھر اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ اور پھر اسکی زندگی اس انسانی ڈھانچہ کی سی ہو گئی۔ جس کی روح قبض کر لی گئی ہو۔

گویا اپنا سب کچھ لٹا کر نارائن ایک دن شب دیال سے جیل میں ملاقات کرنے گیا۔

شب دیال کے چہرے پر وہی سادگی وہی سادہ لوحی اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ لیکن نارائن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ نہ وہ خوش مزاجی نہ

بشاشت، نہ وہ زندگی نہ زندہ دلی۔ نہ وہ درد نہ غم جو آخری ایام میں اس نے اس کے چہرہ پر دیکھا تھا۔ کچھ بھی لیسے نارائن کے پاس نظر نہ آیا۔ اس کی جوانی جیسے رخصت ہو گئی تھی۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ اور کمر جھک گئی تھی۔ اور اس کا چہرہ تمام جذبات سے عاری تھا۔ شب دیال نہ سمجھ سکا کہ نارائن کیا سوچ رہا ہے، کون سی دنیا کے خواب دیکھ رہا ہے۔ چپ چاپ وہ آکر کھڑا ہو گیا تھا ـــــ اچانک جیسے شب دیال کو مسکراتے دیکھ کر نارائن کے چہرے پر کچھ تازگی آئی۔ اور اس نے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔

"شبو تم نے کیا کیا؟"

شبو صفا۔ اس نے کہا۔ "جو مناسب تھا نارائن"

نارائن کے چہرے پر بادل سا آکر گذر گیا۔ "کیا کسی کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگنا مناسب ہے"؟

"میں نے قتل نہیں کیا!"

"پھر!" اور نارائن نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں شب دیال کے چہرے پر جما دیں۔

شب دیال نے کہا۔ "میں نے صرف مزدوروں کو متحد اور منظم ہو کر ظلم کا مقابلہ کرنے کی تلقین دی تھی۔ انہوں نے تنگ آکر ظالم کی ہستی ہی کو مٹا دینا بہتر سمجھا۔"

"لیکن تمہیں میرا خیال نہیں تھا شبو"

"لیکن تم بھی تو وہی کہتے تھے۔ تمہاری نظمیں بھی تو انہیں متحد اور منظم

ہونے کی تلقین کرتی تھیں۔ میں نے صرف انہیں ہی عملی جامہ پہنایا ہے نارائن"

"لیکن میں نے قتل و غارتگری مچانے کے لئے کب کہا؟"

"میں نے بھی نہیں کہا۔"

"پھر یہ ......"

شب دیال نے بات کاٹ کر کہا "نارائن تم مظلوم نہیں تم پر ظلم نہیں ہوتا۔ اس لیے تم ان جذبات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو ظلم سہہ کر مظلوم کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے بنگلوں میں بجلی کے پنکھوں کے نیچے سونے والے ان احساسات کو کیا سمجھیں گے۔ انہیں تو وہی سمجھ سکتا ہے جو ان میں رہتا ہے، ان کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس درد کو محسوس کیا۔ اس ظلم کو محسوس کیا، اور ان میں رہ کر انہیں منظم ہونے کے لئے کہا۔"

"لیکن منظم ہونے کے معنی تشدد کرنے کے تو نہیں"

"منظم گروہ کو قابو میں رکھنا مشکل ہے، خصوصاً اس وقت جب وہ گروہ ناخواندہ اور گنوار لوگوں کا ہو۔"

"پھر تم اس راستہ گئے ہی کیوں؟" اور نارائن کی آنکھیں بھر آئیں۔

شب دیال ہنسا۔ "گاڑی کے حادثوں کے ڈر سے کوئی اس میں چڑھنا تو نہیں چھوڑ دیتا نارائن۔ اگر بیدار ہوتے وقت برسوں کے غلام ضبط نہ رکھ سکیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انہیں بیدار ہی نہ کیا جائے"

"لیکن شبو زندہ رہ کر تم ان کے لئے کہیں زیادہ کام کر سکتے تھے؟"

"انسان مر کر جینے سے زیادہ کام کر جاتا ہے نارائن" تم نے ہی ایک بار

یہ لکھا تھا۔ میں تو صرف تمہارے خیالات کو عملی جامہ پہنا رہا ہوں!" اور وہ ہنسا ملاقات کا وقت ہو چکا تھا۔ نارائن نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور چپ چاپ باہر نکل آیا لیکن تب اس کا چہرہ جذبات سے عاری نہ تھا۔ بلکہ اس پر آہنی ارادہ کے آثار جھلک رہے تھے۔

گھر آکر اس نے اپنی نظموں کے تمام مسودے اکٹھے کئے اور انہیں آگ کے سپرد کر دیا۔ دوسرے دن مزدوروں نے دیکھا۔ یونین میں نارائن نے شب دیال کی جگہ سنبھال لی ہے۔

سیلاب

لاہور

اگست ۱۹۳۲ء

سرِ غرور بلند کر کے ساحل نے سمندر سے کہا۔ میری شان
ہی سے تیری شان ہے۔
سمندر نے پرشور قہقہہ لگایا۔ اور کنارے کو بہا دیا۔

پنڈت رادھے شام ایک رجعت پسند اخبار کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔ ان کا ضمیر اس پژمردہ چنگاری کی طرح تھا، جو خوشامد اور چاپلوسی کی منوں راکھ کے نیچے دب گئی ہو۔ قومی تحاریک سے وہ دور بھاگتے تھے۔ ترقی پسند انجمنوں کی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے انہیں کوسنا۔ ان کا روز کا معمول تھا اور ان کی اس خدمت کے عوض انہیں سرکاری اشتہارات ملتے تھے۔ اگرچہ ان کے اخبار کی اشاعت چنداں حوصلہ افزا نہ تھی۔

اس وقت جب صوبہ بھر کے اخبارات قومی تحریک کی حمایت کر رہے

تھے۔ نوجوانوں کی قربانیوں پر اُن کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ نمک کے قانون کو توڑنے کی تلقین کرتے ہوئے اس کے پردے میں وہ دیر سے سوئی ہوئی قومی تحریک کی بیداری کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کے دن رات تحریک کی مخالفت کرنے میں صرف ہو رہے تھے۔

وہ تحریک کے خلاف لکھتے تھے۔ اس کے محرکوں کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے ــــ "قوم کی طاقت اور وقت ایک نہایت فضول اور بے معنی تحریک کے لئے صرف کئے جا رہے ہیں۔ ملک میں بیسیوں قسم کے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں۔ نمک کا ٹیکس کوئی بڑا بھاری ٹیکس نہیں۔ اگر اسے منسوخ بھی کر دیا گیا۔ تو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچیگا ــــ ساٹھ ہزار ــــ صرف ساٹھ ہزار! حالانکہ لاکھوں روپیہ عیش و عشرت میں صرف ہو رہا ہے۔"

لیکن جب اُنہیں کوئی بتاتا کہ نمک کے ٹیکس کا بار مفلس لوگوں پر زیادہ پڑتا ہے۔ اور غریبوں کے لئے ساٹھ ہزار روپیہ ساٹھ لاکھ کے برابر ہے تو وہ ایک پھیکی ہنسی ہنسکر بے زاری سے سر ہلا دیتے۔

وہ صرف نمک کی تحریک کے خلاف ہوں، یہ بات نہ تھی۔ وہ ہر ترقی پسند تحریک کے خلاف تھے۔ وہ ان قدامت پسند لوگوں میں سے تھے۔ جو برٹش راج کو ہندوستان کے لئے رحمت تصور کرتے ہیں۔ اور سوچا کرتے ہیں۔ کہ اگر یہ راج نہ رہا تو ہندوستان میں پھر ابتری کا دور دورہ ہو جائیگا۔

صوبہ بھر کے اخبار اور رسالے ان کا مذاق اُڑایا کرتے۔ اپنے غپ شپ کے کالموں میں اس پر پھبتیاں کسا کرتے۔ انگریزی دانوں میں وہ YES MAN اور اردو والوں میں "جی حضور یے" کے نام سے مشہور تھے۔ لیکن انہیں اس بات کی شرم نہ تھی۔ بلکہ سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے میں، اشتہارات لینے میں، ان کے ہمعصروں کے دیئے ہوئے یہی "خطابات" ان کے کام آتے تھے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ ان کے اخبار کا نام "رہبر" تھا۔

کانگرس کی طرف سے شہر میں نمک کے قانون کو توڑنے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ ایک عظیم الشان جلوس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پروگرام مرتب ہو چکا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ اور اخباروں میں چونکہ چھٹی تھی۔ اس لئے ہر اخبار نے اپنے ضمیمے نکالنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اور لوگ بڑی بیتابی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ تاکہ صحیح پروگرام سے روشناس ہو سکیں۔ کملا بھی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اخبار کی منتظر تھی۔

وہ پنڈت رادھے شام کی آزاد خیال بیوی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ "رہبر" ہی پڑھنے کے لئے دیتے تھے۔ وہ دفتر میں چاہے کتنے اخبار منگائیں۔ لیکن گھر ان میں سے ایک کو بھی نہ جانے دیتے تھے۔ اور کملا ہمیشہ چاہا کرتی تھی کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھے، اپنی سہیلیوں سے جو وہ سنتی تھی۔ اگرچہ اس کا ایک لفظ بھی اپنے خاوند کے سامنے زبان سے نہ نکلنے دیتی تھی۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس کے خاوند یہ سب چاپلوسی چھوڑ دیں۔ خوشامد کی ساری

سے خودداری کی آدھی بھلی، لیکن اپنے خاوند کے منہ پر اس نے کبھی کچھ بھی نہ کہا تھا۔

چپراسی آکر "رہبر" کا ضمیمہ پھینک گیا۔ اس دو ورق کے اخبار میں بھی انہوں نے اس تحریک کے خلاف ایک چھوٹا سا لیبڈر لکھ رکھا تھا۔ رنج اور غصہ کے مارے کملا نے اخبار کے پرزے پرزے کر دئے۔ اور انہیں کونے میں پھینک کر کوچ میں دھنس گئی۔ تبھی اس کے خاوند "رہبر" کے قدامت پسند ایڈیٹر شری رادھے شام کمرے میں داخل ہوئے۔ پھٹے ہوئے اخبار کے پرزوں کو دیکھ کر انہوں نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے؟"

کملا چپ کوچ پر بیٹھی تھی۔

انہوں نے پھر گرج کر کہا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے؟"

کملا اب کے بھی چپ رہی، اس نے صرف ایک بار اپنے خاوند کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔

برس ہی پڑنے کو تیار بادل کی طرح اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ رادھے شام آہستہ سے اس کے پاس کوچ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "دیکھو کملا، میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ سب جھگڑا بالکل ناپسند ہے، باہر ہی میری کم مخالفت نہیں ہوتی۔ جو گھر میں اس کی ضرورت باقی رہ جائے؟"

"آپ مخالفت کی وجہ کیوں پیدا کرتے ہیں؟"

پنڈت رادھے شام نے پھر جوش سے کہا۔ "میں ہر فضول تحریک کی

تقلید نہیں کر سکتا۔ میں نہ عام لوگوں کی طرح دماغ سے عاری ہوں۔ کہ جو کوئی کہے اسے مان کر اندھا دھند اس کی تقلید کروں، نہ میں بیکار ہوں کہ کچھ کرتے رہنے کے لئے ہر تحریک کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں، اور نہ مجھے شہرت کی تمنا ہے کہ عوام کو غلط راستے پر لگا کر اپنی لیڈری قائم رکھوں"

کملا نے چیخ کر کہا۔ "آپ دیش کا کچھ فائدہ نہیں کر سکتے تو دیش بھگتوں کو گالیاں تو نہ دیں، اپنی خود غرضی کو چھپانے کے لیئے کوئی دوسرا بہانہ آپ کے پاس نہیں کیا؟"

اور ساری کے دامن میں منہ چھپا کر وہ رونے لگی۔

رادھے شام ہنسے "خود غرضی!" زیر لب انہوں نے کہا اور پھر بولے۔ "سادہ لوح عوام کو چھوڑ کر کون غرضمند نہیں۔ سب اپنی اپنی غرض کے لیئے تحریکوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسی کو عزت کی تمنا ہے، کسی کو شہرت کی۔ کسی کو کام کی خواہش ہے کسی کو نام کی، مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں، پھر میں کیوں مفت میں عوام کو دھوکا دوں، جو مناسب سمجھتا ہوں لکھتا ہوں"۔

کملا اب کچھ بھی نہ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن رک نہ سکی۔ اس نے کہا "یوں کیوں نہیں کہتے کہ عیش و آرام آپ کو اتنا پیارا ہے ــــ یہ بڑے بڑے کمرے، یہ کرسیاں میز، یہ کوچ، یہ قیمتی کپڑے اور یہ سب عیش و آرام کے سامان آپ کو اتنے عزیز ہیں۔ کہ اس کی خاطر آپ اپنے ضمیر کو فروخت کر سکتے ہیں"۔

"تو کیا میں اکیلا ہی ان سب کو استعمال کرتا ہوں، کیا تمہارے آرام کے لئے میں یہ سب نہیں کرتا"۔ انہوں نے گرج کر کہا۔

"مجھے ان سب کی کوئی ضرورت نہیں"۔ اور وہ اُٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔
کچھ لمحہ تک مبہوت سے رادھے شام وہیں بیٹھے رہے۔ پھر وہ ہنسے اور زیر
لب انہوں نے کہا "بیوقوف! اور پھر......" عورت!" اور بیزاری سے
سر ہلا کر وہ اٹھے اور باہر چلے گئے۔

"قانونِ نمک کو .... توڑ دو!"
قانونِ نمک کو .... توڑ دو!
قانونِ نمک کو .... توڑ دو
اور پھر "لنگوٹی والے کی جے" اور "بندے ماترم"!
پنڈت رادھے شام بازار کے ایک کونے میں کھڑے جلوس دیکھ رہے
تھے۔ جوں جوں جلوس گذرتا جاتا لوگ دوکانوں سے اُٹھکر، کام چھوڑ کر
اس کے ساتھ شامل ہوتے جاتے۔ مردوں عورتوں کا ایک بے پناہ
ہجوم تھا۔ ایک سمندر تھا کہ بہتا بہاتا چلا جا رہا تھا۔
سب سے آگے بال بھارت سبھا کے لڑکے تھے — معصومیت کے
ننھے اوتار چھوٹے چھوٹے جھنڈے لئے "قانون نمک ...... توڑ دو"
کے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ ان کے چہرے جوش کی وجہ سے سرخ ہو
رہے تھے۔ اور ان پر ایک جلال برس رہا تھا۔ تھکاوٹ کی انہیں پروا نہ
تھی۔ دھول کی یا دھوپ کی انہیں فکر نہ تھی۔ بس ایک ہی دھن تھی۔ کہ
جب ان کا نائک اونچی آواز میں کہے "قانونِ نمک" تو وہ اچھل کر جھنڈیاں

ہلا کر اس سے بھی اونچی آواز میں نعرہ لگائیں "توڑ دو"

وہیں کھڑے کھڑے رادھے شام نے محسوس کیا۔ جیسے ان کا بھی دِل ایک معصوم بچے کے قالب میں چلا گیا ہے۔ اور وہ ان بچوں کے ساتھ اس افسانوی سمندر میں لہروں سا بہا جا رہا ہے۔ تبھی وہ چونک پڑے۔

ایک ٹولی کے آگے آگے ایک شخص بے طرح اچھل رہا تھا۔ چہرہ جوش سے سُرخ تھا۔ سر کے بالوں کی، قمیض کے گریبان یا آستینوں کی اسے کچھ بھی چنتا نہ تھی۔ جنونیوں کی طرح وہ اچھل کر اور بار بار وہ سامنے خلا میں اشارہ کر کے کہتا تھا۔ "اوہ کی آیا" اور ساری کی ساری ٹولی چلا اٹھتی — "انقلاب" اور یہ شخص شہر کا مشہور وکیل تھا۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔

پنڈت جی کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ دور تک اسے دیکھتے رہے اچھل اچھل کر یہی نعرہ لگاتے دیکھتے رہے۔

جب وہ چونکے تو فضا میں لیڈی والنٹیروں کا گیت گونج رہا تھا۔ اور بازاروں کی چھتوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں ان کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر گانے لگی تھیں۔

"اسیں جیل لوانگے
قانون نمک نوں توڑ کے! اسیں جیل"

پنڈت جی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سب سے آگے آگے، ہاتھ میں قومی جھنڈا اٹھائے۔ کملا — ان کی اپنی بیوی گا رہی تھی "اسیں جیل نوں جانگے"

اور سب اس کی آواز میں آواز ملا کر گا رہی تھیں "قانونِ نمک توں توڑ کے" خواتین کا جلوس گذر گیا۔ اس کے بعد شہر کے سرکردہ لیڈر نمک بنانے کا سامان اٹھائے چلے آرہے تھے۔ چھتوں سے اور دوکانوں سے ان پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے معمول سے دُگنے معلوم ہوتے تھے۔

اور ان کے بعد ہزاروں کا ہجوم جیسے بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ پنڈت جی اپنی جگہ سے اٹھے اور ہجوم میں شامل ہو گئے۔

تبھی کسی نے زور سے نعرہ لگایا۔

"قانونِ نمک کو"

سب بولے

"توڑ دو"

ہجوم کی اس آواز میں پنڈت رادھے شام کی آواز بھی شامل تھی لیکن یہ آواز مختلف نہیں تھی۔ اپنے بھائیوں کی آواز سے ہم آہنگ ...... ایک آواز!

ڈاکو

جالندھر
مارچ ۱۹۳۰ء

ڈاکو نے فاتح سے کہا — تم ایک بڑے ڈاکو ہو اور میں
چھوٹا۔ تمہارے بازو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک
پھیلے ہیں اور میں اپنے ہی علاقہ تک پرواز کر سکا ہوں۔
اور فاتح سوچ میں پڑ گیا۔

سکندر اور ڈاکو کی ایک گفتگو کچھ تاریخی اہمیت حاصل کر چکی ہے، یہ کہانی اسی کا شاعرانہ جواز —— پیش کرتی ہے۔

اس وقت، جب سکندر اپنی غیر مفتوح اور ناقابلِ تسخیر فوج کو لئے ہوئے دنیا کے امن داماں میں ہلچل مچا رہا تھا۔ جب بڑے بڑے شہنشاہ اس کے نام کو سن کر کانپ جاتے تھے۔ اور جب خزاں کے مرجھائے پتے کو اپنی مرضی

کے مطابق اڑائے پھرنے والی تیز آندھی کی طرح، جہانبانی کی ہوس اسے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اڑائے لئے پھرتی تھی۔ یونان میں بھی ایک بہادر ڈاکو کے نام کی دھاک جم رہی تھی۔ اس کے دل میں بھی یونان ہی نہیں بلکہ تمام یورپ میں اپنے نام کا دبدبہ جمانے کی آرزو تھی۔

ڈاکو نوجوان تھا، بہادر تھا، اس کا سڈول جسم، لمبے لمبے بازو، اور مضبوط گٹھے ہوئے اعضا، اس کی بے پناہ قوت کا پتہ دیتے تھے۔ بڑے بڑے لڑاکے اس کا نام سن کر لرزہ براندام تھے۔ اور سرمایہ داروں کی راتوں کی نیند اس کے خوف کے باعث حرام ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے پہلو میں ایک رحم بھرا دل رکھتا تھا۔ جس میں غریبوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا مادہ بدرجۂ اَتم موجود تھا۔

کسی رئیس کے ظلم کی داستان سن کر غصہ اور نفرت سے اس کا چہرہ تمتما جاتا تھا۔ ہونٹ پھڑکنے لگتے تھے۔ بھویں تن جاتی تھیں اور اس کی آنکھوں میں خون کے ڈورے دوڑ جاتے تھے۔ لیکن جب کسی مفلس و قلاش غریب کی درد بھری کہانی اس کے کانوں تک پہنچتی۔ اس کا دل ـــ وہی دل جسے پتھر کہا جاتا تھا۔ پانی ہو جاتا۔ اور آنکھوں کے راستے بہہ نکلنے کو بیتاب ہو اٹھتا۔

اجتماعِ ضدین سے بنا ہوا اس کا وجود ہمیشہ اس کے ساتھیوں کے لئے ایک معمہ تھا۔

ایک رات جب سنّاٹا اور تاریکی کائنات پر چھائے ہوئے تھے۔ اس

نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا۔ اور کہا۔ میں آج تمہیں ایک مظلوم کی کہانی سناؤں گا۔

ڈاکو ہمہ تن گوش ہو کر اپنے سردار کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

"بات بہت پرانی ہے" وہ بولا۔ اور پھر خاموشی سے کچھ لمحہ سامنے خلا میں دیکھتا رہا۔

شمع کی مدھم روشنی میں اس کے ساتھی سراپا اشتیاق بنے ہوئے تھے وہ پھر کہنے لگا۔

"کوئی بیس برس ہوئے اسی شہر میں ایک غریب عورت اور اس کا دس بارہ سالہ لڑکا رہتے تھے۔ وہ شروع ہی سے غریب ہوں۔ یہ بات نہ تھی عورت کا خاوند یونان کی حفاظت کرتا ہوا میدان جنگ میں کام آیا تھا۔ اور اسے اور اس کے معصوم بچے کو اس ظالم دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا۔ دنیا ظالم ہے اور کبھی کبھی مجھے خواہش ہوتی۔ اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہ و بالا کر دوں"

اس کی آواز اونچی ہوتی گئی اور اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے اور پھر ذرا نرم ہو کر اس نے کہا۔ نہیں دنیا رحم دل بھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔

وہ ہنسا۔ ایک خوفناک خشک طنز آمیز ہنسی اور پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"خاوند کی موت کے بعد جب آہستہ آہستہ گھر کا اثاثہ ختم ہو گیا۔ اور

رشتہ داروں کے یہاں پناہ حاصل کرنے سے دربدر کی ٹھوکریں کھانا اس نے کہیں بہتر سمجھا۔ تو وہ یہاں آگئی۔ اور پھر محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالنے لگی۔ وہ اتنی عمر رسیدہ نہ تھی۔ لیکن مفلسی اور فاقہ مستی نے اسے قبل از وقت معمر بنا دیا تھا۔

جب بیٹا کچھ بڑا ہوا تو وہ بھی زندگی کی گاڑی کو ٹھیلنے میں حتی المقدور اپنی ماں کی امداد کرنے لگا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ساری کائنات نیند کی گود میں سوئی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں دروازے کے نزدیک اس کا لڑکا بخار اور درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ وہ کئی روز سے بیمار تھا۔ جب تندرست تھا تو جو کچھ محنت مزدوری کرکے لاتا، اس سے دونوں گزارا کرتے تھے۔ اور جو کچھ بچتا اسے مالک مکان اور قرضخواہوں کے حوالے کر دیتے۔ وہ خود بھی ہمسایوں کے گھر چھوٹے موٹے کام کر دیتی تھی۔ جس کے عوض وہ انکی کچھ نہ کچھ امداد کر دیا کرتے تھے۔

لیکن اب لڑکے میں اٹھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ وہ خود بھی اسے چھوڑ کر کہیں نہ جا سکتی تھی۔ اور گھر میں کھانے تک کو نہ تھا۔ اور مالک مکان کا گماشتہ اسے مکان خالی کرا لینے کی دھمکی دے گیا تھا۔ اگر مالک مکان انہیں نکال دے تو ان کا کیا حشر ہو۔ تصور ہی سے اس کی روح کانپ جاتی تھی۔ اور نیند جیسے نئے پنکھ لگا کر اور بھی تیزی سے اڑ جاتی تھی۔

پھر وہ سوچتی — گماشتہ اتنا سنگدل نہیں ہو سکتا۔ کہ بے بس مظلوم عورت

کو جس کا اکلوتا بچہ یوں بیمار ہو، گھر سے باہر نکال دے۔ اور اس خیال سے اسے کچھ تسلی بھی ہوئی۔ لیکن مایوسی کے سیلاب میں یہ تسلی وہی حقیقت رکھتی تھی۔ جو دریا کے کنارے اُگی ہوئی نرم گھاس، جو پکڑتے ہی ہاتھ میں آ جائے۔ اور بہنے والے کو پھر لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔

دوسرے دن ابھی مشرق سے روشنی نمودار بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے اٹھ کر کنڈی کھول دی۔ اور دروازہ ایک بڑے دھماکے کے ساتھ کھلا۔ اس زور سے کہ چھت سے مٹی گرنے لگی۔ لڑکے نے کراہ کر کروٹ لی۔

کمرہ میں مالک مکان کا گماشتہ کھڑا تھا۔ اور وہ اس کی مکروہ اور منحوس شکل کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے تاک رہی تھی۔ صبح کے دھندلکے میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی دیو اپنی غار میں دو بے بس جانوں کو اپنا نوالہ بنانا چاہتا ہو۔

غریب عورت نے اس کے آنے کا مطلب سمجھ لیا۔ اور وہ اپنے بیمار لڑکے کی طرف اشارہ کر کے رونے لگی۔

لیکن گماشتے کے دل پہ اس کے اِن آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

وہ اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اس نے کہا مجھے کچھ دنوں کی مہلت دو، میرا لڑکا بیمار ہے۔ ذرا اُٹھ سکے تو میں مکان سے چلی جاؤنگی۔ کسی اور جگہ سر چھپانے کی کوشش کرونگی۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں"۔ گماشتہ نے گرج کر کہا۔ "مالک کا یہ حکم ہے۔ تم نے قرض کا بیسواں حصہ تک ادا نہیں کیا"۔ اور اس نے ہیبت ناک قسم کھائی۔ کہ وہ چوٹی سے پکڑ کر اسے باہر کر دیگا۔

اس نے سسکتے ہوئے کہا "میں تمہاری پائی پائی ادا کرونگی، مجھے مہلت دو، میرا بچہ بیمار ہے۔ مرنے کو ہے"

"تو میں کیا کروں"، وہ پھر گرجا۔

"رحم" سسکتے ہوئے اس نے بمشکل تمام کہا۔

"نہیں میں اس سے زیادہ کچھ رحم نہیں کرسکتا"۔ اور اس نے بیمار بچے کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور اسے دروازہ کے باہر دھکا دے دیا۔

ناتواں اور کمزور لڑکا لڑکھڑایا۔ گرا اور بیہوش ہو گیا۔

غریب عورت تڑپ اٹھی۔ اور ایک چیخ مار کر بچے پر گر پڑی۔

اس نے لڑکے کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ اور گھن کی طرح غم سے کھایا ہوا اس کا خستہ جسم بچے کی موت کو برداشت نہ کرسکا تھا۔

گماشتے نے نفرت اور حقارت کی ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ تالا لگایا اور چلا گیا۔

بہت دیر بعد، جب ایک راہ چلتے مزدور نے غریب عورت کو اس کے لڑکے پر سے اٹھایا۔ تو وہ مر چکی تھی۔

لیکن لڑکا بچ گیا۔ وہ مزدور اسے اپنے گھر لے گیا تھا، اور کئی راتیں اس

نے اور اس کی بیوی نے اس کے سرہانے بیٹھ کر گذار دی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس کی پرانی قوت عود کر آئی۔ اور ایک دن جب سورج کی کرنیں کائنات پر سونے کی بارش کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی ماں کی قبر پہ جا کر دیوتاؤں کے سامنے عہد کیا کہ وہ اپنی ماں کی موت کا بدلہ ضرور لیگا۔"

ڈاکو خاموش ہو گیا۔ کہانی ختم ہوتے ہوتے اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔ اور گلا بھر سا آیا تھا۔ لیکن اچانک اس کی آواز روکھی ہو گئی اور جیسے بالکل لاتعلقی سے اس نے کہا۔ "وہ غریب میری ہی ماں تھی!" ڈاکو، چپ سحر زدہ سے بیٹھے رہے۔"

لیکن اس روکھے لہجے میں ایک لمبی سانس جیسے گھٹ کر رہ گئی تھی۔

کچھ لمحہ ٹھہر کر اس نے کہا۔ "اور وہ گماشتہ جس نے ہم سے اس قدر ظالمانہ سلوک کیا تھا۔ اپنے مالک کی جائداد سنبھلے خود سرمایہ دار بنا بیٹھا ہے اور اس کے ظلم کی رسی روز بروز دراز ہوتی جا رہی ہے۔

بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ کمرے میں شمعوں کی روشنی میں جھلملاتے ہوئے قمقموں کے نیچے، اپنے گدے دار پلنگ پر سرمایہ دار لیٹا ہوا تھا۔ اپنے مالک کی زندگی میں وہ غلام تھا، گماشتہ تھا۔ لیکن اب، اب تو وہ مالک تھا۔ پھر کیوں نہ اس کے بستر پر ٹانگیں پسار کر لیٹے۔ اس کے سامانِ راحت کا پورا پورا فائدہ اٹھائے!

تبھی اس کے غلام ایک حسین لڑکی کو باندھے ہوئے اندر لائے۔ اور اسے کمرے میں چھوڑ کر وہ خاموشی سے جیسے آئے تھے، ویسے چلے گئے۔

وہ کسی غریب مزدور کی لڑکی تھی۔ اور خستہ اور بوسیدہ کپڑوں میں اس کا نیم برہنہ جسم کانپ رہا تھا۔

سرمایہ دار نے لالچ بھری نگاہوں سے اس کے گورے گداز اعضا کو دیکھا۔ اٹھ کر صراحی سے شراب انڈیل کر اس نے ایک پیگ چڑھایا۔ اور پھر لیٹے ہوئے اس نے کہا۔ "اِدھر آؤ"

لیکن لڑکی اپنی جگہ سے نہیں ہلی اس کی آنکھوں میں خوف سمٹا بیٹھا تھا۔ اور وہ بے بسی کے انداز میں اپنی مشکیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سرمایہ دار اُٹھا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ لڑکی کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔ اور وہ پیچھے کی طرف ہٹنے لگی۔ وہ اسے زبردستی واپس لے آیا۔

"مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو" لڑکی نے التجا آمیز لہجے میں کہا

اس کے نرم نرم بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولا "ڈرو نہیں، ڈرو نہیں" لیکن شہوانی جذبہ سے اس کی آنکھیں خوفناک ہو رہی تھیں۔ اس نے بندھی ہوئی لڑکی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اچانک لڑکی نے اپنے بندھے ہوئے بازوؤں اور سر کا زور دیکر اپنی ساری طاقت سے اسے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ لیکن پھر غضبناک ہو کر اٹھا۔

چھٹپٹاتے ہوئے، اور اپنی مشکیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے لڑکی

نے کہا "غریبوں کی بد دعا سے بچو" اور دانت پیس کر اس نے ایک لات اس کے جمائی۔

اس نے لات کھینچ لی۔ لڑکی دھم سے فرش پر گری۔ روتے ہوئے اس نے کہا "غریبوں کی آہوں سے عرش ہل جاتا ہے"

وہ خوفناک ہنسی ہنسا "غریبوں...... کی...... آہوں...... سے ...... عرش...... ہل...... جاتا...... ہے"۔ نشے کی رَو میں ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے اس نے لڑکی کو اپنے بازو میں باندھ لیا۔

"غریبوں کی آہوں سے عرش ہل جاتا ہے، بیوقوف!" کسی نے رعد کی طرح کڑک کر کہا۔

سرمایہ دار چونک پڑا۔ اس کا گنہگار دِل کانپ اٹھا۔ کمرے میں ایک پراسرار خوفناک انسان کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن اس سہمی ہوئی لڑکی کو وہ دیوتا معلوم ہوا۔

"اُس کی آہوں میں دیوتاؤں کا تمام غضب موجود ہے شیطان" اور یہ کہتے ہوئے اس نے سرمایہ دار کو ایک زبردست ٹھوکر لگائی۔

سرمایہ دار کا تمام نشہ ہرن ہو گیا اور وہ ہچکنیاں کھاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔

اجنبی نے کھڑکی سے جھانک کر آواز دی اور لمحوں میں بھالے تانے ہوئے ڈاکو کمرے میں آ گئے۔

سب کچھ لوٹ لو۔ اور جو سامنے آئے تہ تیغ کر دو۔

اور ڈاکوؤں نے لوٹنا شروع کر دیا۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ تالے توڑے

جانے لگے۔ غلام آزاد کئے جانے لگے۔ جس کسی نے مخالفت کی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور سب زر و جواہر باندھ باندھ کر نیچے پہنچایا جانے لگا۔

"ہلا ہے عرش یا نہیں" ڈاکوؤں کے سردار نے گرج کر کہا۔

"رحم کرو" کانپتے ہوئے سرمایہ دار نے التجا کی۔

"بس میں اس سے زیادہ رحم نہیں کر سکتا۔ آج کمزور اور بیمار لڑکا، اپنی ماں کی موت کا بدلہ لیتا ہے۔"

یہ کہہ کر ڈاکو نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سر سے اوپر اٹھایا۔ اور تین منزلے مکان کی کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔ ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ اور دوسرے لمحہ گلی کے پکے فرش سے ٹکرا کر سرمایہ دار کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

غریب لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ سردار نے اس کی مشکیں کھول دیں۔ اور اسے مکان کے باہر لے آیا۔ پھر اس نے ایک اشرفیوں کا توڑا اس کے ہاتھ میں رکھ دیا اور اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ کہ وہ اسے۔ بخیر و عافیت اس کے گھر چھوڑ آئے۔

جب وہ چلے گئے۔ تو اس نے اپنے سب ساتھیوں سے کہا۔ کہ وہ مکان کو آگ لگا دیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور کچھ دیر بعد لپکتے ہوئے شعلے گناہ اور معصیت کی اس آماجگاہ کو اپنی لپٹوں سے جلا ڈالنے کے لئے لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگے۔

سرمایادار کی دولت شہر بھر کے غریب مزدوروں میں کئی دن تک بانٹی جاتی رہی۔

ایک غیر معمولی شور ۔۔۔ اور سب سپاہی اپنے خیموں کے باہر آ کھڑے ہوئے سب کے دل اس جانباز رہزن کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔

قریباً تیس سپاہیوں کے حلقہ میں ایک تیئس ۲۳ سالہ نوجوان پا بہ جولاں آ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور رگ رگ سے بے پروائی ٹپک رہی تھی۔ عجب نڈر شخص تھا۔ سپاہی مبہوت و ساکن اس کی طرف دیکھتے رہ گئے وہ ڈاکو کو ایک خوفناک ہستی خیال کرتے تھے۔ لیکن خلاف توقع وہ نہایت خوبصورت شخص تھا۔ سپاہیوں کے دل میں اس بہادر کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ لیکن جب انہوں نے اسکے کارناموں کا خیال کیا۔ جو قتل، غارت گری، اور لوٹ سے اٹے پڑے تھے تو وہ ہمدردی آہستہ آہستہ نفرت میں بدل گئی۔

"کیا تم وہی ہو ۔۔۔ یونان کے مشہور چور، جس کا تذکرہ میں آجتک سنتا آیا ہوں"۔ سکندر نے ڈاکو کی طرف نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

ڈاکو نے اپنی گردن بلند کی۔

دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ کوئی فرق نہیں تھا ۔۔۔ دونوں نوجوان۔ دونوں خوبصورت۔ دونوں نڈر۔ لیکن ایک بادشاہ تھا۔ دوسرا باغی۔ ایک آزاد تھا۔ دوسرا غلام! ایک شیر تھا جنگل کا بادشاہ۔ دوسرا بھی شیر تھا پر قفس میں محبوس۔ لیکن خو وہی تھی۔ بو وہی تھی۔ وہی دہاڑ اور وہی دلیری، بولا ۔۔۔

"ہاں میں وہی یونان کا سپاہی ہوں جس پر یونان کو ناز ہے"۔

"سپاہی!" سکندر نے قہقہہ لگایا اور پھر انتہائی نفرت سے کہا ڈاکو لٹیرا دغاباز! تم کہتے ہو تھریس کو تم پر ناز ہے۔ میں کہتا ہوں تم اس کے لیے ایک آفت ہو۔ میں تمہاری بہادری کی تعریف کر سکتا ہوں۔ لیکن تمہارے جرائم پر لعنت بھیجتا ہوں اور تمہیں سزا کے مستوجب قرار دیتا ہوں"

"سزا کا مستوجب ٹھہراتے ہو مجھے۔ خوب!" ڈاکو کے لہجے میں طنز تھا۔ وہ ہنسا۔ "کونسا جرم کیا ہے میں نے؟"

"جرم — ایک جرم ہو تو بتاؤں"۔ سکندر گرجا۔

"مثلاً" — ڈاکو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم نے میرے خلاف بغاوت کی ہے۔ رعایا کے سکون میں خلل اندازی کا باعث بنے ہو۔ خدا کی بے گناہ مخلوق پر ظلم ڈھاتے رہے ہو۔ تمہاری ساری زندگی۔ اپنے بھائیوں کی دولت۔ عزت اور طمانیت تباہ کرنے میں گذری ہے — اور پوچھو گے اپنے جرم تم؟"

"کیا پوچھ سکتا ہوں سکندر" ڈاکو پھر ہنسا "تمہاری اس قید میں کیا پوچھ سکتا ہوں؟ پوچھتا اور ہر بات کا جواب دیتا۔ اگر میں تمہارا قیدی نہ ہوتا۔ آزاد شخص ہوتا۔ جس کی ہر بات تمہیں سننی ہوتی۔

"سناؤ۔ شوق سے میرے الزامات کا جواب دو۔ پوچھو جو کچھ پوچھتے ہو سکندر ان میں سے نہیں۔ جو اپنی طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھائیں"۔

"تو میں ان تمام کارناموں کا جنہیں تم جرائم کے نام سے پکارتے ہو۔

اقرار کرتا ہوں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں۔ کہ اخلاقی طور پر تم مجھے سزا نہیں دے سکتے۔

"کیوں؟ کیا تم نے بے گناہوں کا خون نہیں کیا۔ کیا تمہاری زندگی۔ خدا کے بندوں کو ضرر پہنچانے میں نہیں گذری؟"

"ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟" حلیمی سے مسکرا کر اُس نے کہا

"شوق سے" —— سکندر نے جواب دیا۔

"تمہاری زندگی کس طرح گذری ہے"

"کس طرح گذری ہے"، ایک سچے سپاہی۔ اور ہیرو کی طرح اگر تمہیں خبر نہیں تو جاؤ شہرت سے پوچھو اور وہ تمہیں بتا دیگی کہ میں بہادروں میں سب سے جانباز۔ شہنشاہوں میں سب سے شریف اور فاتحیں میں سب سے طاقتور رہا ہوں۔

"تو کیا شہرت میری نسبت بھی یہی بات نہیں بتاتی۔ پوچھ دیکھو اُس سے، اور وہ ڈنکے کی چوٹ بتا دیگی کہ آجتک دنیا میں اس جیسے طاقتور اور منظم گروہ کا مجھ جیسا طاقتور سردار نہیں ہوا —— کیا کسی نے میری طرح سپاہیوں کی زندگی بسر کی ہے؟ اپنے سپاہیوں سے پوچھو اور وہ تمہیں بتا دینگے۔ اپنی فوج اور .... لیکن یہ باتیں بے معنی ہیں۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔ یونان کا بچہ بچہ میرے نام سے واقف ہے شہرت میرے پاؤں چومتی ہے۔ تمہیں خود معلوم ہے۔ میں کتنی مصیبت کے بعد گرفتار کیا گیا ہوں"

"بجا" سکندر نے کہا۔ "لیکن آخر تم ہو کیا۔ ایک ڈاکو بد دیانت اور ظالم رہزن!"

"اور فاتح کیا ہے سکندر"۔ ڈاکو نے غرور سے سر اُٹھا کر کہا۔ فاتح ڈاکو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تم اپنے آپ کو فاتحین میں سب سے طاقتور بتاتے ہو لیکن ذرا تباہ ذہن تو سہی، کیا تم بادِ سموم کی طرح تجارت اور امن کے میٹھے پھلوں کو جلاتے ہوئے، دنیا کے آرام میں ہل چل مچاتے ہوئے، لوٹتے، مارتے، تاخت و تاراج کرتے ہوئے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک طوفان کی طرح نہیں امڈے؛ کس لیے؟ صرف اپنی ہوس ملک گیری کو بجھانے کے لیے! کیا تم نے ان ملکوں کو جنہوں نے تمہارے ظلم کا مقابلہ کیا جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکا اور ان کی مظلوم رعایا پر ظلم نہیں توڑے"

"ٹھیک ہے" سکندر نے ضبط سے کہا۔ "لیکن اگر میں نے بادشاہوں کی طرح کسی چیز کو چھینا ہے۔ تو اسے شہنشاہوں کی طرح بخش بھی دیا ہے۔ میں نے سلطنتیں بگاڑیں۔ میں نے سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں طاقتیں بگاڑیں اور بنائیں۔ میں نے دنیا میں تجارت۔ صنعت اور فلسفہ کی دنیا آباد کی"

"اور میں نے بھی جتنا امیروں کو لوٹا۔ اس سے کہیں زیادہ غریبوں میں تقسیم کیا۔ میں نے سرمایہ دار اجاڑے ہیں نے سرمایہ دار بسائے۔ جو پہلے سرمایہ داروں کی طرح۔ ظالم اور نفس پرست نہ تھے۔ خود غرض اور متعصب

لوگوں کو ان کی خود غرضی کا سبق دیا۔ اور اپنے بازو۔ غریبوں اور کمزوروں کی مدد کے لئے پھیلا دئے۔ اس فلسفہ کی نسبت جس کی تم بڑ ہانکتے ہو۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ تم نے اجاڑا ہے۔ اسے کسی صورت میں بھی بحال نہیں کر سکتے۔

"ہوں"! سکندر سوچنے لگا۔

"اور تم ایک بڑے ڈاکو ہو۔ اور میں چھوٹا۔ تمہارے بازو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلے ہیں اور میں یونان پر ہی پرواز کر سکا ہوں"۔

سکندر نے سر اٹھایا جیسے اسے کسی نے خواب سے جگا دیا ہو۔ یا کسی نے اس کی محویت کے تار توڑ ڈالے ہوں۔

"چھوڑ دو" اس نے سنجیدگی سے سپاہیوں کو حکم دیا۔ اس کی بیڑیاں کاٹ دو۔ اور اسے اور اس کے ہمراہیوں کو آزاد کر دو"۔

سپاہیوں نے ڈاکو کو آزاد کر دیا۔

سکندر نے ایک لمبا سانس لیا۔

"آہ! کیا ہم ایک دوسرے کے اتنے نزدیک ہیں" اس نے سوچا۔ "اتنا سا فرق ـــــ سکندر اعظم ـــــ سکندر ڈاکو!"

ضربہ

لاہور
اکتوبر ۱۹۳۳ء

ہاتھی تنکوں کے ڈھیر کو مسلتا ہوا چلا گیا۔
تب اُن میں سے ایک نے کہا۔ کیوں نہ ہم رسّا بن
کر اسے باندھ لیں۔
لیکن باقی سب اس پر ہنس دیے۔

تاریکی دور ہوگئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل شکست خوردہ فوج کی طرح بکھر گئے! اور روشنی کی ضیا پاش کرنیں، جیسے قید قفس سے نکل کر فضا کے ذرّے ذرّے پر چھا گئیں۔ سوئے ہوئے نغمے بیدار ہو گئے۔ اور ہرے بھرے درخت، جیسے نئی زندگی پاکر مسرت سے لہکنے لگے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور فضا میں ہلکا سا شور گونج اٹھا۔

نیم کے درخت پر ایک بڑی سی رنگ برنگی چڑیا اس ڈالی سے پھدک

کر اس ڈالی پر جا بیٹھی اور اپنی لمبی سیاہ چونچ کو درخت کی شاخ کے ساتھ رگڑنے لگی۔

شاخوں پر بڑے بڑے کیڑے متحرک سیاہ نقطوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تیزی سے دوڑ رہے تھے۔

چڑیا نے ایک کیڑے کو چونچ میں دبایا اور ایک دو بار شاخ سے پٹک کر ایک ہی دفعہ نگل گئی۔

جانے کتنی دیر سے وہ اِس شغل میں محو تھی؟

یکایک سیاہ نقطوں میں مجموعی حرکت ہوئی اور کیڑوں کی فوج نے چڑیا پر حملہ کر دیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ اڑنے کی کوشش کرتی۔ انہوں نے بیسیوں جگہ سے اس کے جسم کو کاٹ لیا۔ وہ اس کے پروں سے چمٹ گئے۔ دو چھوٹے چھوٹے کیڑے اس کی آنکھوں میں گھس گئے۔

چڑیا نے اڑنے کی کوشش کی۔ لیکن درد و کرب کی وجہ سے شاخ کے نیچے گر پڑی۔ اور تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

تاریکی کی وسیع چادر ایک طرف سے اُٹھ کر سیاہ آندھی کی طرح تمام منظر پر چھا گئی

اندھیرے میں پھر روشنی ہویدا ہوئی۔ گویا مایوس دل میں امید کی شعاع چمک اٹھی۔ قدرت نے سیاہ لبادہ اتار پھینکا، گویا محفل کو محوِ تماشا کرنے کے لئے حسین رقاصہ پردے سے باہر نکل آئی۔

ایک بڑا اسا زہریلا سانپ جھاڑی سے نکل کر آہستہ آہستہ درخت پر

چڑھنے لگا۔

برگد کا وہ بڑا درخت اپنی لمبی گھنی شاخوں میں چڑیوں کے بے شمار گھونسلے چھپائے ہوئے تھا۔

سانپ نے ایک گھونسلے سے چڑیا کا ایک انڈا اٹھایا۔ اور جلدی سے اترنے لگا۔

دم زدن میں چیں چیں کے شور سے فضا گونج اٹھی۔ چڑیوں نے سانپ کو راستہ ہی میں آ لیا۔ ٹھونگے مار مار کر اسے لہولہان کر دیا۔ اس کے منہ سے انڈا گر پڑا، اور وہ درخت کی جڑوں پر گر کر حالتِ نزع میں تڑپنے لگا۔ گھونسلوں میں ننھے ننھے بچے سر اٹھا کر اس تماشا کو دیکھنے لگے۔

روشنی ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح یک دم گل ہو گئی اور منظر پر اندھیرا چھا گیا۔ جس طرح جہاز کے ڈوب جانے پر خلا کو پُر کرنے کے لئے سمندر کا پانی چاروں طرف سے یورش کرتا ہے۔

تاریکی اور روشنی کی جنگ میں، ایک دفعہ پھر روشنی کو فتح حاصل ہوئی۔ بدی پر نیکی غالب آ گئی، ذرہ ذرہ فتح کے غرور سے سربلند ہو گیا۔ درختوں کی شاخیں مست ہو کر ہوا سے اٹھکیلیاں کرنے لگیں۔ اور طیور فتح و نصرت کے راگ الاپ اٹھے۔

منہ میں بین لئے ہوئے، پُرکشش گیت گاتا ہوا سپیرا درختوں کے پیچھے سے خوش گلو ایکٹر کی طرح نکلا اور اپنے شکار کو مبہوت بنانے کے

لئے جھوم جھوم کر بین بجانے لگا۔

سانپ اپنے بلوں سے باہر نکل آئے، اور پھن اُٹھا کر مستی بھرے گیت سننے لگے۔

سپیرے نے بین رکھ کر ایک سانپ پر کپڑا پھینکا، اور اسے ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے دانت نکالنے لگا۔

نغمے کا سحر ٹوٹ گیا۔ سانپوں کا حسین خواب ختم ہو گیا۔ جسے وہ فرشتہ سمجھے تھے وہ شیطان نکلا۔

وہ آگے بڑھے اور مظلوم سانپ کو ظالم سپیرے کے پنجے سے بچانے کے لئے اس پر جھپٹ پڑے۔ ایک ساتھ بیسوں ڈنک سپیرے کے جسم میں پیوست ہو گئے۔

دوسرے لمحہ سپیرا تڑپ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا جسم سیاہ ہو گیا اس کے مُنہ سے جھاگ بہنے لگی۔ اور پلک جھپکتے ہی اسکی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس کا جھولا اور بین دور پڑی تھی۔ پگڑی سر سے اتر چکی تھی۔ اور اس کے بوسیدہ جوتے، پاؤں کے ساتھ لٹک رہے تھے۔

سانپ اس کے ہاتھ سے نکل کر قفس سے نکلے ہوئے جانور کی طرح بھاگ نکلا۔

تاریکی نے اپنا فراخ منہ کھولا اور سب کچھ نگل گئی۔

کشیر ساگر میں شیش ناگ کی سیج پر لیٹے ہوئے بھگوان وشنو نے اپنی مایا سے یہ تینوں مناظر نارد کو دکھائے اور بولے۔ "دیکھا نارد مظلوم کس حربہ سے ظالم کے خلاف لڑتے ہیں"!

نارد جی کسی اور منظر کو دیکھنے کے لئے آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ بھگوان کی بات سنتے ہی چونک پڑے ___ "نہیں بھگوان میں نے ان کے ہاتھ سے کوئی حربہ نہیں دیکھا۔ وہ مظلوم ہیں نہتے اور غیر مسلح، مات لوگ ہیں لاکھوں کی تعداد میں مزدور اور کسان ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گذار رہے ہیں، اور ان پر ظلم کرنے والے عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ نے ان کے ہاتھ میں اس ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیئے کوئی حربہ نہیں دیا۔"

"نارد جی ان کیڑوں، چڑیوں، اور سانپوں کی طرف دیکھو۔ جو حربہ ان کے پاس ہے (اگر وہ اس سے کام لینا چاہیں)۔ وہی دنیا بھر کے مظلوموں کے پاس ہے۔ اس لئے انہیں اسی حربہ سے ظالموں کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دو۔"

"لیکن بھگوان جس طرح مظلوم متحد ہو کر ظالم کا خاتمہ کر سکتے ہیں، اسی طرح ظالم متحد ہو کر ہمیشہ کے لیے مظلوموں کا خاتمہ نہ کر دیں گے؟"

"نہیں نارد ظلم اتحاد نہیں سکھاتا تمکنت اور غرور سکھاتا ہے۔ جو اتحاد کے دشمن ہیں، مظلومی میں عجز اور انکسار ہے۔ جن میں اتحاد پلتا ہے۔ ظالم ایک ہوتا ہے، مظلوم ہزاروں، ظالم علحدہ علحدہ درجوں پر بیٹھے ہیں، مظلوموں کا ایک ہی درجہ ہے، اس لئے جاؤ، اور مظلوموں کے کانوں میں اتحاد کا نغمہ

پھونک دو۔

نارد جی نے سر جھکایا۔ ایک تارا کے تار کو چھیڑا، کھڑتالیں بجائیں۔ اور اتحاد کا گیت گاتے ہوئے ’مات لوک‘ کی طرف چل پڑے۔

راسخ الاعتقاد ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق اس دنیا کو بنانے والے بھگوان وِشنو ہیں۔ اور وہ سورگ میں کشیر ساگر (دودھ کے سمندر) میں شیش ناگ (ایک ہزار پھن والے اژدہا) کی سیج پر لیٹے ہوئے ہیں۔ نارد ایک رِشی ہیں جو انہیں مات لوک (مرتبہ لوک، فانی دنیا) کی خبریں پہنچاتے ہیں۔

مجلّت

جالندھر
نومبر ۱۹۳۰ء

فلسفی نے اپنے نوجوان دوست سے کہا۔ بلا سوچے سمجھے تاریکی میں مت کود و۔

نوجوان ہنسا۔ بولا۔ محبت وہ تاریکی ہے جس میں کودتے وقت سمجھ اور سوچ کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور فہم و فراست جواب دے جاتے ہیں۔

کانجلی

بھائی آنند

تم مزے میں ہو، یہ
جان کر خوشی ہوئی لیکن اگر تمہیں مایوسی نہ ہو تو عرض کر دوں - کہ ادھر بھی
کچھ بُری بسر نہیں ہو رہی - اگر شملہ پہ اندر دیوتا کی نظر التفات ہے تو دوآبہ کو
بھی اس نے فراموش نہیں کیا - اور اگر یقین کرو تو کہوں کہ آجکل تو دوآبہ
بھی سچ مچ شملہ اور کشمیر بن رہا ہے - ہر دوسرے تیسرے بارش ہو جاتی ہے

کیف آور ہوا، دونوں ہاتھوں سے ساغر لنڈھاتی ہے۔ دیکھنے میں نشہ، چھونے میں نشہ، سونگھنے میں نشہ۔ آنکھ، ناک، کان، رگ رگ میں نشے کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ سائیکل اٹھاتے ہیں اور دس کوس کی منزل مار کر یہاں کانجلی کے کنارے آجاتے ہیں۔ تیرنے کے لباس زیب تن کرکے اس گہرے نیلے پانی میں کود پڑتے ہیں! اوپر بوند اباندی ہوتی ہے اور نیچے، بہت نیچے، باندھ کا پانی ہلکی ہلکی آواز میں گرتا ہے۔ ہوا پتوں میں سرسر کرتی ہے۔ اور کچھ عجیب نغموں سے فضا معمور ہو جاتی ہے۔

آج بھی ایسا خیال تھا کہ بارش ہوگی۔ رات ہی سے آسمان پر بادلوں نے اپنی سلطنت قائم کر لی تھی۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے اس آرام دینے والے راج میں کانجلی نہ پہنچنا میرے خیال میں حماقت تھی اس لئے میں اٹھا۔ کام وام میں نے سب کل کے لئے اٹھا دیا۔ جاکر برجو اور مہیش کو تیار کیا۔ اور پھر جاتے جاتے زبردستی اندرناتھ کو بھی ساتھ لے لیا۔ اُس کے یہاں اس کے وطن کے ایک دو بنگالی دوست آئے ہوئے تھے۔ لیکن میرے اصرار پر وہ چل پڑا۔ دراصل آنند، اندرناتھ نہ ہو تو سیر کا یا پکنک کا لطف ہی نہیں آتا۔

"اس اندرناتھ سے کچھ بچتے رہنا"۔ تم نے یہ کیا لکھ دیا آنند جب تمہاری اس بات کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ تم نے اندرناتھ کو دیکھا نہیں۔ ورنہ کبھی ایسا نہ لکھتے۔ بنگالیوں میں جو ایک طرح کا صوبائی جذبہ ہوتا ہے وہ اس میں نام کو نہیں، کھلی طبیعت کا، آزاد خیال

ہنس مکھ نوجوان ہے، میری ہی عمر کا ہوگا، نیلا سا جسم، لمبے لمبے بال اور تیکھے تیکھے نقش پہلی نظر میں دیکھنے والے کو شک گذرتا ہے، جیسے یہ کوئی سینما کا ایکٹر ہوگا، یا بزعم خود ایکٹر بنے پھرنے والے نوجوانوں میں سے ہوگا، لیکن پاس بیٹھنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کس علم کا مالک ہے آنند، اسکی معلومات کی دنیا نہایت وسیع ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہوگا جس پر وہ سیرِ حاصل بحث نہ کر سکتا ہو پھر ان تمام باتوں کے باوجود تکبر کا اس میں نام تک نہیں، جیسے سادہ لوحی اور حلیمی کی ایک چادر میں وہ لپٹا رہتا ہے۔ اور پھر وطن پرستی کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ میں تو سچ مچ اس کا گرویدہ ہوا جا رہا ہوں۔

شملے تو میں کیا آؤں گا۔ برسات کے دنوں میں شملے کو کانجلی سے نسبت؟ گھنے گھنے آم اور جامن کے درخت، ننھی ننھی بوندیں، گہرا نیلا پانی، اور پھر کوئل کی لمبی کوک، میں تو تم سے کہوں گا۔ کہ اگر آسکو تو چند دنوں کے لئے تم ہی اِدھر آجاؤ۔

رگھو

(۲)

گاڑی کا ایک کمرہ

آنند

خط میں ایک دو دن دیر ہو جانے کی کوئی خاص وجہ نہیں، دفعتہً ہی میری صلاح کلکتہ جانے کی ہو گئی ہے۔

بات یہ ہے کہ کسی ضروری کام سے اچانک۔ اندرناتھ کلکتے جا رہا ہے۔ مجھے یہاں کام تو آجکل ہے نہیں۔ کالج بند ہے اور تھیسس[1] کیطرف طبیعت بالکل نہیں لگتی اس لئے سوچا کلکتے ہی چلا جائے، در اصل اندرناتھ کی غیر موجودگی میں یہ دن کس طرح کٹ سکیں گے۔ یہ میں نہیں سوچ سکا۔ اس کی ہستی کچھ غیر معمولی طور پر میری ہستی پر چھا گئی ہے۔ میرے خیالات میری عادتیں میرے کام، اب میرے نہیں رہے، وہ ویسے ہی بنتے گئے ہیں، جیسے اندرناتھ چاہتا رہا ہے۔ دوسرے کے خیالات، اور عادتوں کو بدل دینے کا کچھ ایسا ہی گُر اسے یاد ہے۔ اور اب سمجھ لو، میں کلکتے جا رہا ہوں،

ایک بات کہوں، تمہاری بہت پہلے کی لکھی ہوئی بات یاد آجاتی ہے۔ "اس اندرناتھ سے ذرا بچتے رہنا" اور میں سوچتا ہوں کیا مجھے بچنا چاہیئے؟ کبھی کبھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مجھ پر یوں چھا جانا اچھا نہیں جیسے وہ مجھے کسی گہرے غار میں لئے جاتا ہے، لیکن دوسرے لمحہ یہ سب وہم معلوم ہوتا ہے، میرے خیالات آگے سے سلجھے ہوئے ہیں، میری عادتیں پہلے سے سدھری ہوئی ہیں، اور میری زندگی کا اب کوئی نصب العین معلوم ہوتا ہے لیکن ...... پر چھوڑو۔ فی الحال تو کلکتے جا رہا ہوں،

باقی کلکتے جا کر

رگھو

---

[1] پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے کے لئے لکھا جانیوالا مضمون۔

(۴)

کلکتہ

آنند

رات کتنی ہی بیت چکی ہے لیکن

مجھے بالکل نیند نہیں۔ دل میں ایک ہیجان سا برپا ہے۔ ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ اور جی چاہتا ہے۔ اس آگ کی لپٹوں کو سب طرف پھیلا دوں تاکہ ظلم اور جور کی قوتیں پلک جھپکتے جل بھن کر راکھ ہو جائیں۔

تم شائد حیران ہو گے۔ کہ میں آج یہ سب کیا بک رہا ہوں، لیکن آنند تم کیا جانو کہ میرے خیالات میں انقلاب برپا ہو چکا ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں کلکتے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کلکتہ میرے لئے نیا نہیں بیسیوں دفعہ انگریزی سلطنت کے اس دوسرے بڑے شہر میں آیا ہوں لیکن اندرناتھ نے اس کلکتے میں جو چیزیں دکھائیں ان کا خواب میں بھی خیال نہ تھا۔

آج میں نے وہ خفیہ تہ خانے دیکھے ہیں جہاں پلاسی کی لڑائی میں ہار کر نواب سراج الدولہ کچھ دنوں کے لئے آ چھپے تھے۔ تاریخ میں ان کا ذکر نہیں لیکن دیکھنے پر یہی معلوم ہوتا۔ جیسے نواب ابھی ابھی یہاں سے گئے ہیں

کلکتہ کے نواح کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں اندرناتھ کے ایک دوست رہتے ہیں، وہ کیوں وہاں رہتے ہیں۔ یہ میں نہیں جانتا،

شاید غریب ہیں، اور کلکتہ کے کرایہ کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ ہم ان سے ملاقات کرنے گئے، تبھی باتوں باتوں میں اندر ناتھ نے ان تہ خانوں کا ذکر کیا۔ اور جب میں نے اصرار کیا تو وہ مجھے وہاں لے گیا۔

ایک ٹوٹا پھوٹا سا دالان تھا۔ اس میں سے ہوتے ہوئے ایک دو غلام گردشوں کو طے کر کے ہم ایک تاریک کمرے میں پہنچے۔ اندر ناتھ کے دوست کا نام مکرجی ہے۔ انہوں نے ایک دروازہ کھولا۔ اور ہم سب سیڑھیاں اتر کر تہ خانہ میں جا پہنچے۔ اس جگہ گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے اندر ناتھ پر اتنا ہی اعتماد تھا جتنا اپنی ہستی پر لیکن نہ جانے کیوں دل جیسے دھنسا جا رہا تھا۔

تاریکی میں مکرجی نے ایک کھٹکا سا دبایا۔ سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ کھل گیا۔ اور ایک لمبی گیلری نظر آئی۔ جس کے دوسرے سرے سے روشنی کی شعاعیں اس کے نصف حصہ کو روشن کر رہی تھیں۔

گیلری سے گذر کر ہم تہ خانہ میں پہنچے۔ یہ تہ خانہ کافی روشن تھا۔ اور ہوا بھی یہاں جانے کہاں سے آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا تو اندر ناتھ نے کہا۔ "اس کا بھی انتظام ہے۔"

فرش پر ولیسی قسم کے غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ اور پرانا فرنیچر رکھا تھا۔ جو بہت کچھ خستہ اور بوسیدہ ہو گیا تھا۔ دیواروں پر پرانی قسم کے نقش و نگار تھے۔ جب میں نے پوچھا۔ تو اندر ناتھ نے بتایا۔ کہ یہ شاہی تہ خانے ہیں۔ یہ ان میں سے پہلا ہے۔ ابھی دوسرے میں جائیں گے۔ نواب سراج الدولہ

نے اپنی پریشان زندگی کے کچھ ایام یہاں بسر کئے تھے۔

کمرے میں چاروں طرف اسی زمانہ کی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ جب کلائیو کی حکمت عملی اور چالاکی اور میر جعفر اور اماچند کی غداری نے ہندوستان کے پاؤں میں پہلی بیڑی ڈال دی تھی۔ ایک تصویر میں اماچند کلائیو سے ساز باز کر رہا تھا۔ دوسری میں فریبِ مجسّم کلائیو امیر البحر واٹسن سے جعلی معاہدہ پر دستخط کرانے کے لئے اصرار کر رہا تھا جس میں اماچند کو تین لاکھ روپیہ دینے کی کوئی شرط نہ تھی۔

پھر کچھ اور تصاویر پلاسی کے میدان جنگ، نواب کی شکست اور میر جعفر کی گدی نشینی کی لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان میں ایک تصویر ایسی تھی جس نے میری توجہ خاص طور پر اپنی طرف مبذول کر لی۔ یہ تھی ایک پاگل کی تصویر دیوانہ سر اور پاؤں سے بالکل برہنہ تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بڑھ کر خوفناک ہو رہی تھی۔ اور اس پر گرد پڑی ہوئی تھی جسم پر جگہ جگہ سے خون نکل رہا تھا۔ جو اس نے دیوانگی کے عالم میں کھرونچ کھرونچ کر نکال لیا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا ——— "قوم فروش اماچند"۔

دوسرا تہ خانہ بھی اسی طرح کا تھا۔ اس میں بھی کچھ تصاویر تھیں، لیکن پہلے سے زیادہ دردناک ——— پہلی تصویر ایک شخص کی تھی۔ جو سردی میں سکڑ گیا تھا۔ اس کے بچے رو رہے تھے۔ اس کی بیوی آنسو بہا رہی تھی اور موسم سرما کی ہوا کے تند جھونکوں نے اسے روز روز کے عذاب سے نجات دلا دی تھی تصویر کا عنوان تھا "ہمارا مزدور"

دوسری تصویر ایک شخص کی تھی۔ جو سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اسے کئی طرح کی بلائیں چمٹی ہوئی تھیں۔ جو اس کا خون چوس رہی تھیں۔ یہ تھا۔ "ہمارا کسان"۔

تیسری تصویر ایک سوٹ بوٹ میں ملبوس نوجوان کی تھی۔ جو ایک صاحب کے دریچے میں سلام کر رہا تھا نیچے لکھا "ہمارے بابو"۔

نہ جانے تو دیکھ آیا آنند، لیکن اس وقت سے ہی دل و دماغ میں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے جس ملک کی حالت اتنی دگرگوں ہو، اس کے باشندے سکھ کی نیند کیسے سو سکتے ہیں: وہ تمام مناظر آنند، میری نگاہوں کے سامنے گھوم گھوم جاتے ہیں، اور ان سب سے بڑھکر اس دیوانے کی تصویر!

رگھو۔

(۴)

حوالات

آنند

کیا سوچا تھا۔ اور کیا ہو گیا۔ سب ارادوں اور آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ اور تمہارا دوست ان سنگدل سپاہیوں کے درمیان پھنسا۔

تمہیں کیا لکھوں کہ اس لمبے عرصے میں کن کن مصیبتوں سے گزرا ہوں۔ تم بجا طور پر نالاں ہو کہ میں نے تمہارے ایک بھی خط کا جواب

نہیں دیا۔ لیکن دوست جب آدمی کے ہوش و حواس اس کے اپنے ہوش و حواس نہ ہوں، جب نہ وہ اپنے دماغ سے سوچتا ہو۔ نہ کام کرتا ہو۔ تب اس سے شکایت ہی کیا۔

آج حوالات کی تاریک کوٹھڑی میں تمہاری ایک بات مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہے "اس اندرناتھ سے ذرا بچتے رہنا۔" اس وقت میں اس پر ہنس دیا تھا۔ لیکن آج سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے۔ کہ اگر میں تمہاری اس بات پر کان دیتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا۔

مجھے گرفتاری کا یا مجبوسی کا رنج نہیں۔ ایک انقلاب پسند گروہ کے کسی ممبر کو (کیونکہ میں انقلاب پسند گروہ میں شامل ہو گیا تھا) جیل تو کیا پھانسی تک کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔ رنج ہے تو اس بات کا کہ شاید میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔

اندرناتھ انقلاب پسندوں کی انجمن کا ممبر تھا۔ یہ انجمن سارے بنگال میں پھیلی ہوئی تھی۔ پنجاب میں بھی شاید وہ انجمن ہی کے کسی کام کے لیئے پہنچا تھا۔ میری بدبختی کہ میں اسکی خوبیوں کا مداح ہو گیا اور اسکے ساتھ چلا آیا۔ اس کے ساتھ رہ کر انجمن میں شامل نہ ہونا ناممکن سی بات تھی۔ میں نے تمہیں تہ خانوں کے متعلق ایک خط لکھا تھا۔ اس سے شاید تمہیں احساس ہو گیا ہو گا۔ کہ کس طرح آدمی کے خیالات بدل جاتے ہیں اور اسے معلوم بھی نہیں ہوتا۔ ہماری انجمن سارے بنگال میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور مشہور شہروں اور قصبوں میں اس کے مرکز تھے۔ جنگلوں اور پہاڑوں

ہیں اسکے خفیہ مقام تھے۔ لیکن اس کی خبر اندر ناتھ اور چند دوسرے سرکردہ ممبروں کے سوا کسی کو بھی نہ تھی۔ اکثر کو تو یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ انجمن میں کون کون ممبر ہیں۔

اسے کامیابی سے چلانے کے لئے ہمیں روپیہ کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ صلاح ہوئی کہ انجمن کے پہاڑی مقام کے نزدیک قصبے کے سرکاری بنک میں ڈاکہ ڈالا جائے۔

تجویز کے مطابق ہم چھ اشخاص مقررہ وقت پر بنک کے نزدیک پہنچ گئے۔

شام کا وقت تھا۔ بنک کے کلرک آہستہ آہستہ چلے گئے تھے۔ خزانچی حساب کی پڑتال کر رہا تھا۔ اس وقت ہم نے موقع کو غنیمت جان کر سپاہی پر حملہ کر کے اسے بیہوش کر دیا۔ پھر خزانچی کو پستول دکھا کر نوٹوں کے بنڈل اور روپوں کی تھیلی اٹھا لائے۔ اندر ناتھ کے سپرد موٹر لانے کا کام تھا۔ عین وقت پر کار پہنچ گئی۔ روپیہ رکھا۔ اور رہوا ہو گئے پندرہ بیس منٹ تک اندھا دھند موٹر چلا کی۔ لیکن ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ دونوں موٹریں پوری رفتار سے چل رہی تھیں موٹر کی آواز کے ساتھ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔

اندر ناتھ موٹر کو خفیہ مقام کی طرف لے چلا۔

تقریباً دو گھنٹہ تک موٹر چلتی رہی۔ اب ہم چڑھائی پر تھے۔ سڑک کئی جگہ سے مڑتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی گرے اور گہری کھڈ میں گم

ہو گئے۔ لیکن اندر ناتھ کو موٹر چلانے میں کمال حاصل تھا۔ ہم موٹر میں بیٹھے جا رہے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جھولا جھول رہے ہیں۔ ابھی جو سڑک اوپر سر پر نظر آتی، دوسرے لمحے نیچے کھڈ میں دکھائی دیتی پہاڑی درخت بجلی کی سی سرعت سے گذرے جا رہے تھے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اندر ناتھ کوئی دیوتا ہو یا غیر معمولی انسان۔ اسے موٹر چلانے میں اتنا ہی کمال حاصل تھا۔ جتنا سیاسیات اور معاشیات میں۔

لیکن دوسری کار نے ہمارا تعاقب نہ چھوڑا۔ اندر ناتھ کی طرف دیکھا تو جیسے پتھر کے بت کی طرح بیٹھا کار چلائے جا رہا تھا۔ سامنے گھاٹی تھی۔ اندر ناتھ نے موٹر کو بلندی پر چلانا شروع کیا۔ لیکن ابھی ہم نے چوتھائی حصہ بھی طے نہ کیا تھا کہ ٹائر ایک آواز کے ساتھ پھٹ گیا۔ اور موٹر کی رفتار رک گئی۔ اندر ناتھ نے جھپلا ننگ لگا دی۔ مکرجی نے نوٹوں کے بنڈل اور تھیلیاں اسکی طرف پھیلائیں لیکن اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اترنے کی کوشش کرتا، موٹر پیچھے کو چلنا شروع ہو گئی۔ ڈھلوان کافی تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور موٹر رک گئی۔ تعاقب کرنے والوں کی موٹر کے ساتھ ہماری موٹر ٹکرا گئی تھی لیکن الٹی نہیں۔ کیونکہ پولیس والوں نے موٹر چڑھائی کے شروع ہی میں روک دی تھی۔

ہمارے حواس اڑ گئے تھے۔ ہم نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ ہم نے بھی پستول نکالے۔ دونوں طرف

سے گولیاں چلنے لگیں۔ پولیس کے دو سپاہی زخمی ہوئے۔ ہمارا ایک رفیق مارا گیا۔ میری ٹانگ میں گولی لگی۔ پولیس نے سب کو گرفتار کر لیا۔ ہاں مکرجی بھاگ گئے۔ ہماری موٹر کی تلاشی لی گئی۔ لیکن کچھ برآمد نہ ہوا۔

اور آج مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ اندر ناتھ اور مکرجی نے یہ سب سازش انقلاب پسند نوجوانوں کو پھنسانے کے لئے کی تھی۔

جیل کے انسپکٹر درگا داس بینرجی میرے بڑے دوست ہیں کلکتہ میں کئی بار میں انکے یہاں ٹھہرا ہوں مجھ پر بڑے مہربان ہیں۔ ان کی وساطت سے ہی مجھے یہ سب پتہ چلا ہے۔ بنگال میں انقلاب پسندوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے ہی سرکار نے اندر ناتھ اور مکرجی کو مقرر کیا تھا۔

اب سوچتا ہوں آنند، تو سب کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ کبھی خیال کرتا ہوں۔ کہ درگا داس کہیں غلط نہ کہتے ہوں۔ بہر حال جسمانی تکلیف کے علاوہ میں کس ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو سوچتا ہوں۔ میں نے اندر ناتھ کا کیا بگاڑا تھا۔ کہ اس پردیس میں مجھے لا پھنسایا لیکن کسی نے کہا ہے نا کہ سادہ لوحی کے خون پر ہی ریا کاری پلتی ہے۔

رگھو

پی۔ ایس

خط درگا داس ہی کی وجہ سے تمہیں پہنچ رہا ہے نہیں تو شاید تم جانتے بھی نہیں اور میں شائد کالے پانی پہنچ جاتا۔

سنٹرل جیل (۵)

آنند

میں سلطانی گواہ بن گیا۔ اگرچہ مجھے کچھ بہت کہنا نہیں پڑا۔ پھر بھی میرے بیان کی وجہ سے دو نوجوانوں کو کالے پانی کی سزا ہوگئی۔

تم شاید مجھے بزدل اور ڈرپوک خیال کرو، لیکن سچ جاننا آنند میں کسی ڈر یا خوف کیوجہ سے سلطانی گواہ نہیں بنا۔ بلکہ میرے اس فیصلہ کی تہ میں انتقام کا وہ جذبہ کام کرتا ہے۔ جو دن رات میرے تن بدن کو جلایا کرتا ہے

میں ابھی تک زیر حراست ہوں۔ لیکن کچھ دن تک آزاد ہو جاونگا۔ اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں آنند میں اندرناتھ کا پتہ لگاؤنگا، اور اس سے پورا پورا بدلہ لونگا

اپنی سادہ لوحی پر مجھے ہنسی آتی ہے۔ اندرناتھ کو میں فرشتہ سمجھتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہو گیا۔ وہ شیطان تھا۔ مقدمہ کی سماعت ختم ہو گئی۔ لیکن ابھی تک نہ اندرناتھ کا پتہ ہے۔ اور نہ مکرجی کا۔ پتہ لگتا بھی کیسے؟ وہ دونوں تو کہیں دوسری سازش کھڑی کر رہے ہونگے۔ مجھے درگا داس نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ پولیس نے انہیں مفرور قرار دے دیا ہے۔ اور پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ان کو گرفتار کرانے میں امداد کرنے والے کو انعام دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ لیکن مجھے سب حقیقت کا علم ہے۔

اور اسی لئے میں سلطانی گواہ بنا۔ گرفتار شدہ رفیق تو سزا پانے ہی لیکن اندرناتھ سے بدلہ لینے کے لئے کون رہتا؟

رگھو

(۶)

ایک دور افتادہ گاؤں

آنند

ایک مدت کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ سوچتا تھا۔ اب کچھ نہ لکھونگا۔ اور اس تنہا مقام میں، داغِ ناکامی سینے پر لئے چپ چاپ اس دنیا سے گذر جاونگا۔ لیکن شاید جب تک تمہیں لکھ نہ لونگا مجھے موت نہ آئیگی۔

آنند مجھے دھوکا ہوا۔ سچ مچ بہت بڑا دھوکا ہوا۔ بہت دیر ہوئی تہ خانے میں قوم فروش اُما چند کی تصویر دیکھی تھی۔ رہ رہ کر وہ آجکل میرے سامنے پھر جایا کرتی ہے۔ اور میں محسوس کیا کرتا ہوں۔ کہ میں پاگل ہو جاونگا لیکن شائد اس وقت تک میں زندہ نہ رہونگا۔

جیل سے آزاد ہونے کے بعد میں اندر ناتھ کی تلاش میں منہمک ہو گیا درگا داس سے میں نے پوچھا۔ لیکن اس نے کہا۔ اس کی رہائش کا علم بڑے افسروں کے سوا کسی کو نہیں۔ در اصل وہ سرکار کا راز ہے، کسی کو بتایا نہیں جا سکتا۔ لیکن میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا۔ کہ میں اسے ڈھونڈ کر دم لونگا۔ میں تے شاہی تہ خانوں کی تلاشی کروادی تھی۔ اور وہ کھنڈر بالکل ویران پڑے تھے۔ ایک دن، جیسے کسی غیبی ترغیب سے میں ادھر جا نکلا۔ وہیں ویران اور ڈراونے تہ خانوں میں سے مجھے ان تمام خفیہ جگہوں کا پتہ چل گیا، جہاں انجمن کے مرکز تھے۔ مجھے پورا یقین تھا۔ کہ اندر ناتھ کسی دوسرے گروہ کو مرتب

کرنے میں منہمک ہوگا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو۔ میں اسے اسکے کیفر کردار کو پہنچا دینا چاہتا تھا۔

کئی جگہوں کی تلاش کے بعد میں ایک دن اسی مقام پر پہنچا، جہاں ہماری کار رک گئی تھی۔ وہاں بغیر رکے میں چوٹی پر پہنچ گیا۔ پہنچ تو گیا لیکن کچھ لمحوں کے لئے میں حیران سا کھڑا رہ گیا، کیونکہ سامنے پھر گھاٹی تھی۔ اس وقت مجھے ایک بار پھر یقین ہوگیا۔ کہ اندرناتھ نے جان بوجھ کر کار روک دی تھی کیونکہ آگے تو خوفناک گھاٹی تھی یقیناً وہ کار کو اسمیں نہ گراتا۔

چپ چاپ وہاں کھڑا میں تمام واقعات پر غور کرتا رہا۔ اور انتقام کا جوش جیسے میرے سینے میں دہکنے لگا جوش سے اٹھ کر خود مجھ کو ہی جلانے لگا۔

تبھی سامنے کی چڑھائی پر میں نے کسی انسانی شکل کو چڑھتے دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں مجھے وہ اندرناتھ ہی معلوم ہوا تب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میں نیچے اترا۔ اسوقت کہیں ذرا بھی پاؤں پھسل جاتا۔ تو ہڈی ہڈی چور ہو جاتی۔ لیکن مجھے کسی بات کا خیال نہ تھا میں بھاگا چلا جاتا تھا۔

اندرناتھ دوسری طرف چوٹی کے قریب پہنچ گیا میں بھی اوپر چڑھنے لگا جلد ہی میری ٹانگیں پھولنے لگیں آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا لیکن میں چڑھتا چلا گیا۔

اس سے پہلے کہ میں اندرناتھ پر وار کرتا پستول کی سرد نالی میری کنپٹی کے قریب تھی۔ اور میری کلائی اسکے پنجے میں۔

اور میں حیران اور بھونچکا کھڑا تھا۔ کیونکہ یہ اندرناتھ نہ تھا۔ بلکہ ایک خوبصورت

حسینہ تھی۔ جس نے مردوں کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے بال اگرچہ بہت لمبے نہ تھے۔ لیکن بے پروائی سے اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ شاید یہ اندرناتھ کی بہن تھی۔ کچھ لمحہ میں مبہوت سا اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "... لیکن ... ہیں ... تو اندر ...."

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "بھول گئے رگھو مجھے اتنی جلدی بھول گئے۔ ابھی تو مجھے انجمن کے اصول کے مطابق تمہیں اس پستول کا نشانہ بنانا ہے"۔

اور وہ دیوانوں کی طرح ہنسی۔

سردی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ لیکن میں نے اپنا تمام حوصلہ اکٹھا کر کے کہا "اندرناتھ ..."

"میرا نام اندرا ہے" اس نے کہا

میں نے کہا "اندرا میں خود ایسی ارادے سے آیا تھا تم نے پولیس کی جاسوس بن کر اتنے بے گناہوں پر جو ظلم کیا ہے اس کا بدلہ لینے ہی میں آیا تھا"

"پولیس کی جاسوس"۔ وہ ہنسی "رگھو اپنے گناہ کو چھپانے کیلئے جھوٹ کیوں بولتے ہو"

"لیکن تمہیں پولیس نے گرفتار کیوں نہیں کیا"

"وہ کر ہی نہیں سکی۔ وہ تو اندرناتھ کی تلاش میں ہے۔ لیکن میں تو اندرا ہوں۔ ہاں میری گرفتاری کے لئے انعام ابھی تک مشتہر ہے"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس دیوانے امام چند کی تصویر ایک بار میری آنکھوں میں گھوم گئی۔

اندرا نے پھر ہنس کر کہا "رگھو تم بزدل نہیں۔ میں ہی بزدل ہوں۔ انجمن کے اصولوں کے مطابق مجھے تمہیں فوراً موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکی میں نہیں جانتی رگھو لیکن اب بھی میں ایسا نہیں کر سکتی۔ انجمن کے اصول کیخلاف میں بھی چلی ہوں اور اسکی سزا موت ہے۔ تم مجھے قتل کرنے آئے تھے۔ لو قتل کر دو۔"

اور اس نے پستول میرے سامنے پھینک دیا۔

میں خاموش ساکن مبہوت کھڑا رہا۔

اس نے پستول اٹھا لیا۔ "تم مجھ پر فائر نہیں کر سکتے رگھو لیکن انجمن کے اصول مجھے مارنے یا مر جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ تمہیں میں نہ مار سکونگی۔ خود مر ونگی۔

اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس کی نعش خون میں لت پت دھرتی میں پڑی تڑپ رہی تھی اور پستول اس کے ہاتھ سے دور جا پڑی تھی۔

آہ آنندا وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔

رگھو

ایم ظہیر الدین نے فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۹ سرکلر روڈ و باہتمام عبدالمجید خان منیجر چھپوا کر اردو بک سٹال لوہاری دروازہ لاہور سے شائع کیا